یاد کی رہ گزر
شوکت کیفی

''کھانا کھا کر میں اور کیفی پھر انہیں سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ کیفی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ...... ''تین مہینے بعد تو آپ کی شادی ہو جائے گی۔ پھر آپ کو تو ہم یاد بھی نہیں رہیں گے''۔

میں نے کہا ...... ''آپ بھی تو بمبئی جا کر شادی کرلیں گے؟''

کیفی نے فوراً کہا ...... ''اب میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔''

پھر میں نے بڑی بوڑھیوں کی طرح سمجھانا شروع کیا ...... ''شادی ضرور کرنی چاہیے۔ شادی کے بغیر زندگی ادھوری رہ جاتی ہے۔ انسان مکمل نہیں ہوتا۔''

— اسی کتاب سے

یاد کی رہ گزر

شوکت کیفی

یہ کتاب میں اپنے دونوں بچوں

شبانہ اعظمی اور بابا اعظمی

کے نام معنون کرتی ہوں جو مجھے

دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں

— شوکت کیفی

ترتیب

☼....☼....☼

لفظِ تشکّر

میں جب بھی مڑ کے دیکھتی ہوں تو اپنی زندگی کے اُتار چڑھاؤ یاد کر کے کچھ حیرت بھی ہوتی ہے کچھ خوشی بھی۔ سوچتی تھی کہ بیتے دنوں کے بارے میں لکھوں۔ بہت دنوں تک صرف سوچتی ہی رہی۔ آخر ایک دن ہمت کر کے لکھنا شروع کیا۔ میرا بچپن حیدرآباد میں گزرا ہے۔ حیدرآباد کا کلچر بڑا رنگا رنگ ہے۔ وہاں رنگوں کے نام بھی انگریزی میں نہیں اُردو میں اور بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن میری زندگی میں جو رنگ سب سے گہرا ہے وہ کیفی کا رنگ ہے اور وہ اِس کتاب میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔ کیفی کے ساتھ میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے اِس لیے لکھتے ہوئے مجھے کسی مبالغے سے کام لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بیتے دن جوں کے توں میں نے کاغذ پر اُتار دیے۔

اس کتاب کے سلسلے میں سب سے پہلے میں جاوید صاحب کا شکریہ ادا کروں گی کیونکہ کیفی کے جانے کے بعد میرا دل بالکل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ میں نے یہ کتاب ادھوری ہی چھوڑ دی تھی لیکن اُنھوں نے مجھ سے اصرار کر کے اِس کتاب کو مکمل کروایا۔

میری بیٹی شبانہ اُس کپتان کی طرح ہے جو جہاز کو اپنی کاوش سے منزلِ مقصود

تک پہنچاتا ہے۔ یہی کام اُس نے میری کتاب کے ساتھ کیا۔ اگر شبانہ نے اتنی دلچسپی لے کر اس کتاب کے چھپنے کا انتظام نہ کیا ہوتا تو شاید یہ مسودہ میرے سرہانے ہی پڑا رہ جاتا۔

میں سہیل اختر کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے اِتنی محنت اور توجہ سے کمپیوٹر پر اِس کتاب کو لکھا۔ عبید اعظم اعظمی اور خصوصاً ڈاکٹر ظہیر علی کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی ایڈیٹنگ میں میری بڑی مدد کی۔ نسرین رحمان عرف چینی کا بھی تہہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے اِس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

میں سلمٰی صدیقی کی بھی مشکور ہوں جنھوں نے 'ایک تاثر' لکھ کر میری عزت افزائی کی۔

شوکت کیفی

اکتوبر 2005

پروفیسر قمر رئیس

پیش لفظ

'یاد کی رہ گزر' شوکت کیفی صاحبہ کی ایسی سوانحی دستاویز ہے جو اپنے طرزِ بیان کی شفاف سادگی کے علاوہ کئی دیگر منفرد اوصاف کے لیے یاد رکھی جائے گی۔ اول یہ کہ یہ خود نوشت آغاز اور انجام سے بے نیاز بیچ سے شروع ہوتی ہے۔(جو خود زندگی کا استعارہ ہے۔) دوسرے یہ کہ یہ کسی ایک انسان کی سرگزشت نہیں بلکہ ایسے دو انسانوں کی رزمیہ گاتھا ہے جو پیار کی ایک زنجیر سے، ایک جیسے مقدر سے، ایک نظریہ سے اور دکھی انسانیت کے نروان کی ایک عظیم تحریک سے بندھے رہے۔ تیسرے یہ کہ یہ ایسے دو فنکاروں کی توزک ہے جو بیسویں صدی کی نصف آخر کی انقلابی روشن خیالی کے فروغ میں اپنی قلم کاری اور اداکاری سے، مقدس دیوانگی کے ساتھ وابستہ رہے۔

'یاد کی رہ گزر' کے کچھ حصے کیفی صاحب کی زندگی میں ہی شائع ہوتے رہے لیکن اب یکجا صورت میں یہ بکھری بکھری تصویریں ایک ایسا مرقع بن گئی ہیں جس میں رومانوی ہیجان بھی ہے، کڑوی کسیلی زمینی سچائیوں کا دبا دبا کرب بھی، ازدواجی زندگی کا انمول حسن اور آسودگی بھی اور اُس کی محرومیوں اور دکھوں کا وہ احساس بھی جو دل کو نچوڑ کے رکھ دیتا ہے۔اِس میں جوانی کی شہ زور اُمنگوں اور آرزوؤں کی

سرشاری بھی ہے اور دو باغی جیالوں کی سرکشی کی ایسی رزمیہ کہانی بھی جس نے حیدرآباد اور مجواں (ضلع اعظم گڑھ) جیسی قدامت پسند جاگیردارانہ بستیوں میں تہلکہ مچا دیا۔ اُن کی دقیانوسی تہذیب کی ہلتی دیواروں کو کچھ اور ہلا دیا۔

اِس مختصر سی آپ بیتی کو جس وصف نے کم از کم ذہنی اور جذباتی سطح پر، جس طرح کی تہہ داری اور معنویت بخشی ہے وہ ہے شوکت کیفی صاحبہ کا نہایت واضح ترقی پسندانہ نقطۂ نظر، دردمندانہ احساس اور انسانی تہذیب کا ایک روشن وژن۔ ایسا نہیں ہے کہ حیدرآباد کی جاگیردارانہ تہذیب سے اُن کا جذباتی رشتہ نہ رہا ہو۔ کتاب کے پہلے ہی باب میں اِس شہرِ کمال کی اُردو پرستی، شعر و شاعری، اُس کے ملبوس، آرائش، رنگا رنگ کھانے، رسم و رواج سب کا بیان ملتا ہے لیکن اُس کے ساتھ ہی اعلیٰ حضرت اور اُن کے دربار سے جُڑے نوابین کی عیش کوشیاں، غریب رعایا پر ظلم و ستم، معصوم اور مجبور دوشیزاؤں کی عصمت ریزیاں اور اِسی طرح کی دیگر سفاکیوں کی روداد بھی اُنھوں نے بڑی جرأت سے سنائی ہے۔ شوکت صاحبہ نے جبر و بیداد کے ان گنت چشم دید واقعات نقل کیے ہیں۔ یہی معروضی واقعہ نگاری دوسرے ابواب میں نظر آتی ہے۔

کتاب کا وہ حصہ مجھے کسی رومان پرور ناول کی طرح دلچسپ لگا، جہاں شوکت کیفی صاحبہ نے اپنے آغازِ عشق کی روداد رقم کی ہے۔ کیفی سے پہلی ملاقات، پہلی نظر کا آر پار ہو جانا، صبر و ضبط کی ناکام کوششیں، ناز و انداز، ڈرامائی پیش قدمیاں، خاندانی آن بان اور عزت و ناموس کی آہنی بیڑیاں (شوکت صاحبہ کی شادی ماموں زاد بھائی سے طے ہوچکی تھی صرف رسمِ شادی کی تاریخ طے ہونا تھی) آخر اچانک صبر و ضبط کے باندھ کا ٹوٹ جانا اور عشقِ بلا خیز کا سُنامی بن کے ہوش و حواس اور

سارے ماحول پر چھا جاتا۔ یہ سارے داخلی اور خارجی واقعات بڑے حساس اور نازک ڈھنگ سے، لیکن شگفتہ اُسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔ جو قاری کو اُردو کے ایک legendry انقلابی شاعر کی رومان پرور زندگی اور کچلے ہوئے انسانوں کے مقدر سے اُس کی اٹوٹ وابستگی کی کہانی سناتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ کیفی اعظمی اپنے کردار و گفتار اور فکر و عمل میں اپنے دوسرے معاصرین سے کیوں کر مختلف تھے۔ مشکلات، مفلوک الحالی اور عوارض کے مقابل ڈٹ کر سینہ سپر ہونے کے لیے اُن کے اندر عزم و استقلال کی کیسی عجیب قوت پنہاں تھی۔

بمبئی کے زمانۂ قیام کی روداد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ملک کی آزادی اور تقسیم کے سانحہ تک اور دوسری 1947 کے خصوصاً 1948 کی پارٹی کی دوسری (کلکتہ) کانگریس اور 1949 میں ترقی پسندوں کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد۔ پہلا دور پارٹی کے کمیون کی بے سروساماں لیکن جوشیلی زندگی کا دور تھا۔ ذرا اُس کی ہلکی سی جھلک دیکھیے:

> ''کمیون پہنچ کر میں نے کیفی کا چھوٹا سا کمرہ دیکھا جس میں ایک جھلنگا سا بان کا پلنگ، اُس پر ایک دری، گدا، چادر، تکیہ، ایک طرف چھوٹی سی میز کرسی، اُس پر کتابیں، اخباروں کا ڈھیر، چائے کا مگ اور ایک گلاس۔ مجھے اُس کمرے کی سادگی پر بہت پیار آیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا'' ٹھہر جاؤ، میں اس کمرے کو اتنا خوبصورت بنا دوں گی کہ اس کمرے کی قسمت ہی بدل جائے گی۔''

کمیون میں کھانے کا پنچائتی نظام بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہر ایک کو اپنے برتن خود دھونے پڑتے تھے لیکن شوکت صاحبہ جو حیدر آباد کے ایک اعلیٰ متوسط اور مہذب گھرانے میں پلی بڑھی تھیں اور وہاں بیلے اور موگرے کے پھولوں کی مہک میں

بسے ہوئے ملبوسات پہنتی تھیں۔ کمیون کی زندگی سے مطمئن اور خوش تھیں۔ وہاں کامریڈوں کی باہمی محبت اور ایثار و اُخوت کے بے لاگ جذبات نے اُن کا دل جیت لیا تھا۔ پھر شوہر کی والہانہ محبت جو مدن پورہ کی مزدور بستیوں میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ شوکت کیفی بھی آہستہ آہستہ عوام دوستی اور دردمندی کی پاکیزہ فضا میں ڈوب کر ایک نئے قالب میں ڈھلتی گئیں۔

تقسیم اور آزادی کے بعد کا زمانہ اُن کے اور کیفی کے لیے زیادہ پُر آزمائش تھا۔ پارٹی کی نئی پالیسی کا اعلان جو نئے سیکریٹری بی.ٹی.رندیوے نے کلکتہ کانگریس میں کیا تھا اُس میں کہا گیا تھا کہ ''مسلح انقلاب کا وقت آچکا ہے۔ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔'' P.W.A کی بھیمڑی کانفرنس میں بھی ترقی پسند ادیبوں کو کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں اس انقلابی عمل میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ IPTA کا حال بھی یہی تھا۔ شوکت صاحبہ لکھتی ہیں: ''اِپٹا میں دھول اُڑ رہی تھی۔ زیادہ تر آرٹسٹ جیل میں تھے یا پارٹی کی غلط پالیسی کی وجہ سے اِپٹا سے علیحدہ ہو چکے تھے۔''

''حیدرآباد سے آکر میں نے پارٹی کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ سیکٹیرین ازم کا دور دورہ تھا۔ کامریڈوں کی وہ نرمی، پیار محبت سب رفوچکر ہو چکے تھے۔ ہر کامریڈ دوسرے کامریڈ کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا تھا گویا وہ جاسوس ہو۔۔۔کیفی سے بھی (جو انڈر گراؤنڈ تھے) کبھی بیس پچیس دن میں چوری چھپے ملنے کا موقع ملتا تھا۔''

شوکت کیفی صاحبہ نے بڑے صبر و استقلال سے اِس دورِ اِبتلا کی مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کیا۔

شبانہ اعظمی آج ملک کی صفِ اول کی فلم اور تھیٹر آرٹسٹ ہیں، ایک اداکارہ کی حیثیت سے اپنے کارناموں اور بے مثل سماجی خدمات کے صلہ میں اُنھیں بے شمار

ایوارڈ ملے اور وہ راجیہ سبھا کی رکن نامزد کی گئیں۔ جو ایک بڑا قومی اعزاز ہے لیکن ذرا دیکھیے کہ اِس باکمال اور ملک کے لیے قابلِ فخر آرٹسٹ کی پیدائش کیوں کر ہوسکی۔

''شبانہ ہونے کو تھی۔ کیونکہ میرا پہلا بچہ گزر گیا تھا اس لیے میں تو بہت خوش ہو گئی لیکن پارٹی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ آرڈر ہوا ''ابارشن کروادیا جائے۔'' کیوں کہ کیفی انڈر گراؤنڈ ہیں۔ میں بے روزگار ہوں۔ بچے کی ذمے داری کون لے گا۔ مجھے بے حد تکلیف پہنچی۔ اِس بات پر جب ایک میٹنگ ہوئی تو اُس میں میں نے کہا'' یہ بچہ مجھے چاہیے اور جیسے بھی ہو میں اسے پالوں گی۔ مجھ سے بہت کچھ کہا گیا لیکن میں اپنی جگہ اڑ گئی تھی۔ اُس میٹنگ میں صرف ہمارے دوست مہدی نے میرا ساتھ دیا۔ آخر پارٹی نے مجھے یہ بچہ پیدا کرنے کی اجازت دے دی۔''

اور یوں شبانہ اعظمی نے اِس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ شوکت صاحبہ نے بچی کی ولادت کے بعد اُس کی پرورش کیوں کر کی۔ اِس کے بارے میں ایک چھوٹا سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میں نے پرتھوی تھیٹر میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ روز صبح نو بجے شبانہ کو کندھے پر لاد کر، پرتھوی تھیٹر لے جاتی جو اوپیرا ہاؤس میں تھا اور دوپہر میں دو بجے واپس آکر کھانا پکاتی۔ اکثر بس میں آتے ہوئے میرے پرس میں صرف دس نئے پیسے ہوتے تھے اور میرا دل دھڑکتا تھا کہ اگر یہ سکہ کھوٹا نکلا تو مجھے اِن سارے مسافروں کے سامنے اِس بس سے بے عزت ہو کے نیچے اُترنا پڑے گا۔''

شوکت صاحبہ نے 'خودنوشت' میں اِس طرح کے ان گنت واقعات بیان کیے ہیں جو اُن کی، کیفی کی اور شبانہ کی زندگی، اُس کی سختیوں اور آزمائشوں پر روشنی

ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ ور اِن فنکاروں نے کیسے حوصلہ شکن حالات میں ادب اور آرٹ کی خدمت گزاری کا حق ادا کیااور اِس وسیلہ سے ملک میں، ترقی پسند آدرشوں اور اقدار کی آبیاری کا فرض نبھایا۔

کیفی صاحب زبردست قوتِ ارادی ہی نہیں، زبردست حسِ جمال اور حسِ مزاح بھی رکھتے تھے۔ جو زندگی کے بے پایاں حسن اور اُس کی مسرتوں سے اُن کی گہری وابستگی کا ثبوت تھا۔ شوکت صاحبہ نے ایسے کئی دلچسپ واقعات نقل کیے ہیں جو اُن کی ذہانت اور خوش طبعی کا نقش اُبھارتے ہیں۔ یہ شاید 1983 کی بات ہے۔ میں ماسکو گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ شہر سے چالیس میل دور ایک پُر فضا مقام پر واقع نرسنگ ہوم میں کیفی صاحب زیرِ علاج ہیں۔ اتوار کا دن تھا۔ میں ایک روسی دوست وِلو دِیا کو لے کر نرسنگ ہوم پہنچ گیا۔ ایک کشادہ کمرہ میں وہ اور شوکت صاحبہ قیلولہ کر رہے تھے اور شاید کوئی ہم سخن نہ پا کر بور ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں کِھل اُٹھے۔ کیفی صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے پاس چھوٹی سی میز پر دواؤں کی کچھ شیشیاں رکھی تھیں۔ میں نے کہا کیفی صاحب آپ اچھے بھلے ہیں پھر یہ دواؤں کی شیشیاں کیوں؟ بولے، ''ساری کسلمندی اِن شیشیوں کی وجہ سے ہی ہے۔ اصل دوا کی بوتل، جو صحت بخشتی ہے یہ لوگ اندر لانے ہی نہیں دیتے۔ آپ کچھ مدد کریں۔'' میں ہنس دیا۔ میں نے وِلو دِیا سے اُن کی فرمائش پوری کرنے کو کہا تو اُس نے اتوار کا عذر کیا کہ اِس دن مشروبات کی ساری دکانیں بند ہوتی ہیں۔

اپنے آبائی گاؤں مجواں اور اُس کے بد حال لوگوں سے اُن کی بے کراں محبت تو ایک کہاوت بن گئی ہے۔ شوکت صاحبہ نے کیفی کی زندگی کے اُس تناظر کو بھی سادگی سے اُبھارا ہے اور بتایا ہے کہ کیسے آہنی عزم اور حوصلے کے ساتھ اُنھوں

نے اِس ویران سے گاؤں میں نئی انسانی سہولتوں اور علم اور عمل کی روشنی پھیلا دی۔
حیدر آباد اور بمبئی ہی نہیں، مجواں، لکھنو اور دوسرے شہروں میں بھی شوکت صاحبہ کو ایسے کردار ملے جن کے وجود کی انمول سچائیوں نے اُنھیں متاثر کیا اور اُن کے دل میں ایک دیر پا نقش چھوڑا۔اُن کے خاکے بھی 'یاد کی رہ گزر' میں بڑی مہارت سے کھینچے گئے ہیں۔ جو کتاب سے نکل کر قاری کے ذہن میں بس جاتے ہیں۔اُن میں خود اُن کے روشن خیال والد کا کردار ہے۔ سلطانہ آپا، ہنّے بھائی، رضیہ آپا،

عصمت چغتائی، اداکار سنجیو کمار، پرتھوی راج کپور اور کمیونسٹ تحریک سے تعلق رکھنے والے ان گنت ایثار نفس، جیالے کردار جو اپنے عزم و عمل سے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یاد کی اِس رہ گزر میں تاریخ کا ایک انقلابی عہد، ایک انقلاب آفریں نظریہ، انقلابی دانشوروں، ادیبوں اور آرٹسٹوں کی ایک متحرک جماعت شانے سے شانہ ملائے، سانس لیتی، خواب دیکھتی، نعرے لگاتی اور قدم بہ قدم آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کو سنوارنے کے افکار و عزائم سے معمور یہ دور ہوا میں تحلیل ہو کر نابود ہو گیا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ تاریخی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ انسان کو مفاد پرست طبقوں کے جبر و قہر سے نجات دلانے کا ہر خواب، ہر نظریہ، ہر مہم آنے والی نسلوں کو منتقل ہو جاتی ہے اور پھر ترقی پسند تحریک نے تو ہزاروں نظمیں، گیت، غزلیں، ڈرامے، ناول، افسانے اور فلم ایسے تخلیق کیے ہیں جو ہمارے تہذیبی ورثہ کا جاندار حصہ بن چکے ہیں۔ آج بھی یہ ترقی پسند خیالات ہمارے ذہنی اُفق پر ابر پاروں کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔اُن افکار و خیالات کی توسیع و اشاعت میں، دوسرے ان گنت فنکاروں کی طرح کیفی اعظمی،

شوکت کیفی اور شبانہ اعظمی نے بھی خونِ جگر صرف کیا ہے۔

'یاد کی رہ گزر' میں اِس جنون و شوق کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سفر تو جاری ہے اور جاری رہے گا۔ زندگی کو سنوارنے کے جن تصورات کو لے کر وہ چلے، وہ آج بھی دقیانوسیت، قدامت پرستی، فرقہ پرستی اور جبر و بیداد کی سفاک طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

O

سلمیٰ صدیقی

ایک تاثر

مجھے دوسروں کی زندگی میں جھانکنا اچھا لگتا ہے، شاید کچھ اور لوگوں کو بھی اچھا لگتا ہو، اِس کی وجہ صرف تاک جھانک یا تجسّس کے علاوہ بھی ہوسکتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ناٹک، نوٹنکی، سنیما، بائسکوپ، تھیٹر اور ٹیلی ویژن، ہماری زندگی کا اتنا اہم حصہ کیوں کر بن پاتے ؟یہ تو extension ہے اُس داستان گوئی، مشاعروں، بیت بازی، کٹھ پتلی کے تماشوں اور رقص و سرود کی محفلوں کا، جسے انسانوں نے اماوس کی سیاہ راتوں میں، مصیبتوں کے بوجھ تلے، اُمید کی ایک کرن، روٹی کے ایک ٹکڑے، کسی چاند سے مکھڑے اور کسی روشن مستقبل کے انتظار اور استقبال میں اپنے دل میں بسا لیا ہو۔ آپ بیتی اور سوانح عمری بھی اِسے زمرے میں آتی ہے۔ اسے مونولوگ یا خود کلامی بھی کہا جاسکتا ہے۔ مغربی ادب میں اِس کی متعدد مثالیں موجود ہیں لیکن اُردو ادب میں اِس کا استعمال نسبتاً کم ہوا۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اِس صنف میں صنفِ نازک نے چند اضافے کیے۔ اپنے محدود مطالعے اور اُس سے بھی کم وسائل کے باوجود چند خواتین نے 'روز نامچے' یا 'خطوط' کے ذریعے اپنے اور اپنے ماحول اور معاشرے کے بارے میں باہر کی دنیا ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' کے مصداق ایک رابطہ برقرار رکھا اور

ایک رشتہ قائم کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں چند خواتین نے اپنے حالاتِ زندگی تحریر کیے۔ اہم ناموں میں محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج) اور والدہ عبدالقادر نے اردو میں اس کی شروعات کی اور نذر سجاد نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ قرۃالعین حیدر نے اپنے مخصوص اور منفرد اسٹائل میں اِس فن کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ پاکستان میں چند اہم آپ بیتیاں لکھی گئیں، حمیدہ اختر رائے پوری اور ادا بدایونی کی تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اپنی اپنی کہانیاں لکھی تو گئیں پاکستان میں لیکن دونوں خواتین کا ماضی اور میکہ، چونکہ ہندوستان سے وابستہ ہے، جہاں وہ اپنا بچپن چھوڑ آئیں لیکن اُن کی یادیں بغیر کسی قانونی رکاوٹ کے اُن کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں ایک نئے ملک میں رہنے بسنے کے لیے روانہ ہوگئیں۔ ہندوستان میں حمیدہ سالم کی سوانح بھی ایک نہایت معتبر اور مستند تصنیف ہے۔ اِس سلسلے کی ایک نہایت اہم کڑی کتابی صورت میں اِس وقت میرے سامنے ہے 'یاد کی رہ گزر'۔ بیگم شوکت کیفی کی پچپن سالہ شب و روز کی وہ داستان ہے جسے سچ پوچھیے تو کسی تعارف یا تبصرے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جب اِسے پڑھنا شروع کیا تو بڑی لاپروائی اور بد دلی سے اِس پرنظر ڈالی یہ سوچ کر کہ مانا شوکت کیفی ایک بہت عمدہ آرٹسٹ ہیں، بارہا اُن کو اسٹیج پر اور فلموں میں دیکھ چکی ہوں، اب بھلا اُن کو رائٹر بننے کی کیا ضرورت تھی، لیکن پہلا باب پڑھتے پڑھتے ہی میں چونک گئی۔ گھبرا کے میں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں میری حیرت و استعجاب اور رشک وحسد کو کوئی انجانا کیمرہ تو محفوظ نہیں کر رہا ہے۔

شوکت کیفی نے کتاب کی ابتدا اپنے بچپن اور اپنے گھریلو ماحول سے کی جس کے بغیر اس آپ بیتی میں وہ رنگینی، مٹھاس اور شائستگی نہ ہوتی جس نے شروع سے

آخر تک تمام کرداروں کو ایک ڈورے میں پروئے رکھا۔ اُن کے گھر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا کہ اُس عہد میں عام طور پر مسلمان متوسط گھرانوں کا ہوتا تھا، جہاں باپ کی حیثیت ایک سرپرست کی ہوتی اور ماں اولاد کی صحت اور سلامتی کے علاوہ سخت گیر نگراں کے عہدے پر فائز ہوتی۔ روزی روٹی کی تگ و دو اور باہر کی دنیا سے نمٹنا گھر کے مالک کے سپرد ہوتا اور بچوں، ملازمین اور رشتے داروں اور تیج تہوار اور معاشی اونچ نیچ کو سنبھالنا ماں یعنی مالکن کے حصے کردیا جاتا۔ ذمے داریوں کی اس تقسیم یا سمجھوتے سے گھروں میں امن و امان قائم رہتا تھااور غیر شعوری طور پر ماحول پُرسکون رہتا لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ بیٹے کی حیثیت بیٹی کے مقابلے میں اہم اور معتبر مانی جاتی۔ لڑکے کی پیدائش پرلڈو بانٹے جاتے اورلڑکی کی ولادت پر 'اللہ کی مرضی' کہہ کر صبر کرلیا جاتا تھا۔ لیکن شوکت خوش نصیب تھیں کہ اُن کے والد اُن روایتی والدین میں نہیں تھے، جو بیٹے بیٹی میں تفریق کرتے۔ اُن کے ابا جان کا ایسا قابلِ قدر اور دوستانہ رشتہ اُس وقت تو کیا آج بھی مشکل سے ملے گا۔ اُن کی والدہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ اپنی اولاد کی پرورش اور روزمرہ کی زندگی میں بھی تن دہی اور سلیقے سے کام لیتی تھیں۔ بہن بھائیوں کی زندگی میں کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں تھی اور سب ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کرتے تھے۔ اِس خوشگوار ماحول نے شوکت کیفی کے بچپن اور لڑکپن میں اُن کو کہیں کسی complex کا شکار نہیں ہونے دیااور گھریلو متوازن فضا نے اُن کو اپنی آئندہ زندگی کو انتہائی ہمت، صبر اور ذہانت سے بسر کرنے میں بھرپور تعاون اور حوصلہ دیا جسے آگے چل کے اُنھوں نے اپنے بچوں میں بانٹ دیا۔

کیفی اعظمی سے اُن کی ملاقات بھی ایک ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ ترقی پسند

تحریک کے وہ اچھے دن تھے اور اُس سے بھی اچھے ترقی پسند ادیب اور شعرا تھے۔ سجاد، جعفری، مخدوم، مجروح، ساحر، جاں نثار اختر، جذبی، اور کیفی اعظمی، طلبہ و طالبات کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ترقی پسند ادیب و شعرا کا قافلہ حیدرآباد میں اپنی تاریخی اور اہم ادبی کانفرنس کے سلسلے میں پہنچ چکا تھا اور مہمان و میزبان تقریب کے خیالوں میں سرشار تھے کہ خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہیں پہلی بار شوکت کیفی نے کیفی سے ملاقات کی۔ صرف ملاقات ہی نہیں اپنی پوری زندگی اُن کے ساتھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیفی بھی تقریباً اس کیفیت سے دوچار تھے۔ اِس سلسلے میں اُن کے درمیان جو کچھ بھی ہوا اُس کا اِس قدر سچا اور تفصیلی بیان شوکت کر چکی ہیں کہ میرا اِس بارے میں کچھ کہنا بے معنی ہوگا۔ لیکن مجھے یہ داستان پڑھ کے ایسا ضرور محسوس ہوا جیسے مثنوی 'زہرِ عشق' کی مہ جبیں نے اپنا بوسیدہ کاغذی پیرہن اتار کر اچانک شوکت کا روپ دھار لیا ہو اور سماج اور اُس کے نام نہاد رکھوالوں سے اپنا خون بہا طلب کر رہی ہو۔

کانفرنس کی کامیابی اور اختتام پر مندوبین اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔ کیفی بھی، لیکن کیفی تنہا نہیں گئے۔ وہ شوکت کے خوابوں کو زادِ راہ کے طور پر اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اُس کے بعد کیا ہوا؟

ایک روشن خیال اور انسانی جذبات کی قدر کرنے والا باپ اپنی بیٹی کی نئی زندگی کے آغاز میں اُس کا پورا پورا ساتھ دینے اور انصاف کرنے کے لیے ایک اجنبی شہر میں پہنچ جاتا ہے، لیکن کامریڈ سجاد ظہیر (بنّے بھائی) اور اُن کی انتہائی دردمند اور مہربان شریکِ زندگی رضیہ سجاد ظہیر نے باپ بیٹی کو چند لمحوں میں اجنبیت کے حصار سے نکال دیا، اور وہیں ترقی پسند شعرا و مصنفین کی موجودگی میں شوکت

اور کیفی اعظمی نے اپنی نئی نویلی زندگی کا ایک خوبصورت قانونی اور سماجی نام دے دیا اور بمبئی کے شب و روز میں اِس طرح گھل مل گئے کہ پچپن سال کی مدت کو اِس طرح طے کیا جیسے یہ صرف وہ ایک طویل لمحہ تھا جس کے گزر جانے کے بعد ہی اُس کی پہلی اور آخری اہمیت کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔

تقریباً نصف صدی ساتھ ساتھ بِتانے میں کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ نئے بیاہتا ہنی مون پر کشمیر، پیرس اور سوئٹز لینڈ جاتے ہیں، شوکت اور کیفی نے اپنا ہنی مون پارٹی کمیون میں گزارا۔ وہاں بڑے ستاروں والے ہوٹل نہیں تھے تو کیا ہوا؟ وہاں چنار، آلپس اور روشن قندیلوں والی رقص گاہیں نہیں تھیں تو کیا ہوا؟ اُن کے سامنے ہری بھری گھاٹ کی پہاڑیاں تھیں۔ آم کیلے اور کٹھل کے درخت تھے، چمیلی کے پھول اور مہندی کے جھاڑ تھے، صبح سویرے چائے لانے والے مودب ویٹر اور بیرے نہیں تھے تو کیا ہوا؟ کھلی اور خوشگوار فضا میں ایک پتیلے میں چائے اُبلتی رہتی تھی جسے اپنے اپنے مگ میں لے کر کامریڈ، ظلم اور ناانصافی اور نابرابری کے خلاف جد وجہد کے لیے برسرِ پیکار ہوتے۔ کیفی اعظمی اور شوکت اس ہراول دستے کے جانباز سپاہی تھے۔

کمیون میں ہر طرح کے ساتھی تھے۔ جو ایک بڑے خاندان کے افراد کی طرح ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے۔ پیسے کے علاوہ اُن کے پاس سب کچھ تھا اور منزل بھی ایک تھی۔ سب کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے۔ شوکت نے اس ماحول کا غور سے اور انتہائی دردمندی سے مشاہدہ کیا اور زندگی کی بے سروسامانی کو ہمت اور یگانگت سے ایک دل چسپ، باوقار اور خوشگوار موڑ دے دیا۔ اداکاری کی تربیت کسی اسکول میں نہیں مل سکی تو کیا، زندگی سے بڑا کون سا اسکول ہوسکتا تھا؟ اپنی ضرورتوں

کو اپنے شوق اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈھال لیا اور آنے والے دنوں میں ایک باصلاحیت اداکارہ کی حیثیت سے تھیٹر اور فلم کی دنیا میں قدم جمالیے اور اپنی ایک منفرد جگہ بنالی۔

اس دوران وہ اپنی زندگی کے بہت خوبصورت دور میں داخل ہوئیں اور اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا انتظار کرنے لگیں۔ بروقت علاج نہ ہونے کی وجہ سے اُن کا جگر گوشہ اُن سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ اس واقعے کو جس طرح اُنھوں نے بیان کیا وہ کسی مرثیے سے کم نہیں۔

مجھے احساس ہے کہ میں 'یاد کی رہ گزر' پر کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی ہوں جسے ممبئی کی زبان میں کھالی پیلی ٹائم کھوٹی مت کرو کہا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'یاد کی رہ گزر' اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنی اور اپنے جیسوں کی زندگی کے شب و روز میں جھانکنے پر مجبور کردے گی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہر زندگی ایک کتاب ہوتی ہے، کردار اور حالات اور عہد مختلف ہوسکتے ہیں لیکن قسمت کی بالادستی سے کسی کو مفر نہیں۔

میں شوکت کیفی کو اُردو ادب میں ایک اچھی، مستند اور سچی تصنیف پر مبارکباد دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ 'یاد کی رہ گزر' کو اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی صورت میں لائبریریوں میں ہی نہیں، دل و دماغ کی گہرائیوں میں بھی ایک جائز مقام ملے گا۔

○

یاد کی رہ گزر

حیدر آباد

میں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ نیم ترقی پسند تھا یعنی میرے ابا تو لڑکیوں کی تعلیم کے انتہائی حق میں تھے لیکن میرے دادا اور چچا انتہائی خلاف۔ میرے ابا نے 1938 میں اپنی دونوں بڑی بیٹیوں، یعنی میری بڑی بہن لیاقت خانم (عمر سترہ سال) اور منجھلی بہن ریاست خانم (عمر سولہ سال) کو خاندان کی مرضی کے خلاف مشن اسکول میں شریک کروادیا تھا۔ اسکول میں مخلوط تعلیم تھی یعنی لڑکیوں کے ساتھ لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ رہا پردے کا سوال تو اُنھوں نے آج سے ۹۵ سال پہلے ہی اپنی بیوی کا برقعہ اُس وقت اُتروادیا تھا جب وہ اُنھیں بیاہ کر سہارنپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں لوہاری سے حیدر آباد لا رہے تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر اُن کا برقعہ اُتار کر اٹیچی میں بند کروادیا تھا۔

میرے دادا کٹر قسم کے مولوی، عربی فارسی کے عالم تھے۔ جنھوں نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ ابا جان کو عربی فارسی کی تعلیم تو مکمل کروادی تھی لیکن انگریزی کے خلاف تھے۔ جب ابا جان نے محسوس کیا کہ انگریزی کے بغیر نوکری نہیں مل سکتی تو اُنھوں نے چھپ کر انگریزی پڑھنی شروع کی اور میٹرک پاس کرلیا۔ اُن کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ وہ بی.اے.کے بچوں کو پڑھا سکتے تھے۔

جب اُنھیں محکمۂ ایکسائز میں انسپکٹر کی نوکری مل گئی تو اُنھوں نے تیلگو پڑھنا شروع کردیا کیونکہ حیدر آباد میں نوکری کے لیے تیلگو جاننا ضروری تھا۔تیلگو وہ بہت اچھی طرح پڑھ سکتے تھے اور بول سکتے تھے۔ بچوں کو پڑھانا اُن کی hobby تھی۔

ابا روزے نماز کے سخت پابند تھے۔میری ماں بھی پانچ وقت کی نماز پڑھتی تھیں۔ میری منجھلی بہن ریاست خانم نے،جنھیں ہم چھوٹی آپا کہتے تھے، سات سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرلیا تھا اور نو سال کی عمر میں حفظ۔ میں بھی نماز پڑھتی تھی لیکن قرآن شریف کا صرف اُردو ترجمہ پڑھا کرتی تھی۔ مجھے تجسس تھا کہ آخر قرآن شریف میں ایسا کیا لکھا ہوا ہے کہ آدھی دنیا اِسے مانتی ہے۔

ہمارے ابا کی تنخواہ صرف تین سو روپے تھی۔ جس میں وہ اپنے دس بچوں کی پڑھائی اور کھانے پینے کا خرچ اُٹھاتے تھے۔ میری ماں انتہائی نیک، پرہیز گار اور کفایت شعار بیوی تھیں۔ اپنے شوہر کی پسند پر سر جھکا کر چلنے والی خاتون لیکن انتہائی حسّاس اور خوددار بھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بڑے بھائی جان، خورشید علی خان، جو بی.اے .میں پڑھ رہے تھے، ایک مہینے کا غلّہ صرف چالیس روپے میں لا کر دیتے تھے،جس میں گھی اور لکڑی بھی ہوتی تھی (اُس زمانے میں کھانا لکڑی کے چولہے پر پکتا تھا)۔پکانے والی ماما کی تنخواہ آٹھ روپے تھی۔ بڑے بھائی جان جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتے تھے اُن کا ماہانہ خرچ صرف اکیس روپے تھا۔ میری بہنوں کے ٹیوشن ماسٹر کا نام ملّپا تھا۔ اُن کی فیس صرف پندرہ روپے تھی۔ وہ صبح پانچ بجے آیا کرتے تھے اس لیے اُنھیں ناشتہ بھی دیا جاتا تھا۔ ہمارے گھر ناشتے میں اکثر صرف کھچڑی، چٹنی، دہی اور پاپڑ ہوتے تھے۔کبھی کبھی قیمہ بھی بن جایا کرتا تھا۔ ہم لوگ اِسکول شِکرم میں جاتے تھے۔ یہ ایک طرح کی دو بیلوں والی گاڑی

ہوا کرتی تھی جس میں چاروں طرف چلمنیں اور دونوں سائڈ میں سیٹیں ہوتی تھیں۔ جن پر کم از کم آٹھ لڑکیاں بیٹھ سکتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب ہم منگل ہاٹ نام کے ایک محلے سے گزرتے تھے تو ایک چائے خانے سے بیگم اختر کا وہ گانا 'دیوانہ بنا نا ہے تو دیوانہ بنا دے' ضرور سنائی دیتا تھا۔گوشت کی دکان سے 'چار گنڈے پاؤ سیر لے جاؤ چار گنڈے پاؤ سیر' کی آوازیں آتی تھیں۔ چار گنڈے سولہ پیسے کے ہوتے تھے۔ اُس وقت گوشت چونسٹھ پیسے کا ایک سیر ملتا تھا۔ ایک روپے میں چھیانوے پیسے ہوتے تھے۔ یہ میں 1941 کی بات کر رہی ہوں۔ جب میری عمر تیرہ سال کی تھی اور میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ حیدر آباد میں حالی پیسہ چلتا تھا۔ چھ پیسے کا ایک آنہ ہوتا تھا۔ ہندستان کے دیگر حصوں میں کلدار سکّے کا رواج تھا جہاں چار پیسوں کا ایک آنہ ہوتا تھا۔اِسی طرح حیدر آباد میں مہینوں کے نام بھی الگ طرح کے ہوا کرتے تھے مثلاً آذر، دے، بہمن،اسفندار، فروردی، ارضی بہشت، خورداد، تیر، امرداد، شہرور، مہر، آبان۔

مجھے دوپٹے رنگنے اور چُننے کا بے پناہ شوق تھا۔ میں بڑی آسانی سے اپنے کُرتے کے رنگوں اور ڈیزائنوں کو اپنے دوپٹے پر اُتار لیا کرتی تھی۔ مجھ میں یہ قدرتی دین تھی کہ میں کوئی سا بھی رنگ بڑی آسانی سے دو تین رنگوں کو ملا کر بنا لیا کرتی تھی۔میرا یہ شوق دیکھ کر میری ماں نے مجھے ایک تخت دے دیا تھا۔ رنگوں کا ڈبہ، برش،گوند گویا ہر وہ چیز جس کی مجھے رنگنے میں ضرورت محسوس ہوتی تھی منگوا دیا کرتی تھیں۔

حیدر آباد کی ایک خوبی یہ تھی کہ نظام نے حیدر آباد میں اُردو کی بہت خدمت کی تھی۔ ایک تو عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی۔ ہر اسکول میں اُردو لازمی قرار دی گئی تھی۔

حتیٰ کہ سرکاری زبان بھی اُردو ہی ہوا کرتی تھی۔

حیدر آباد میں رنگوں کے نام انگریزی میں نہیں لیے جاتے تھے۔ اُردو میں اُن کے اپنے خوبصورت نام ہوتے تھے مثلاً زعفرانی، کاسنی، پیازی، کتھئی، اودا، تُرئی کے پھول کا رنگ، سبز رنگ، موتیا کا رنگ، آسمانی، سرمئی، شفتالو، کاہی، عنابی، لال رنگ، مور کنٹھی کا رنگ، بیگنی، صندلی۔ تمام نام اب تو مجھے پوری طرح یاد بھی نہیں ہیں۔

میرے دوپٹے اس قدر خوبصورت رنگوں کے ہوتے تھے کہ اسکول میں لڑکیاں میری کلاس میں جھانک جھانک کر دیکھتی تھیں کہ آج میں نے کون سے رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہے۔

اُس وقت دوپٹے کی ململ دو آنے گز تھی۔ جو ساڑیاں میری بہنیں پہن کر کالج جاتی تھیں وہ ڈیڑھ روپے سے چھ روپے تک ملتی تھیں۔ بہترین شیفون کی ساڑی دس روپے میں مل جایا کرتی تھی۔ میری بڑی بہن کی شادی میں سونا چالیس روپے تولہ تھا اور سچی زری کی کام دانی یا کارچوبی ساڑی صرف ۳۰ روپے یا ۳۵ روپے میں مل جایا کرتی تھی۔

ایک کپڑا جو 'کارگا' کہلاتا تھا بہت ہی خوبصورت ہوتا تھا۔ باریک سوتی جالی پر عورتیں دھاگے سے خانے گِن گِن کر اُس پر ڈیزائن بناتی تھیں۔ یہ کپڑا اُس زمانے میں بھی کافی مہنگا تھا۔ یعنی اٹھارہ روپے گز ملتا تھا۔ اُس کے کُرتے لڑکیاں کھڑے دوپٹے کے ساتھ شادیوں میں پہنا کرتی تھیں۔ یہ سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ عمر رسیدہ عورتیں چھوٹا سا کُرتا ساڑی پر پہنتی تھیں۔

حیدر آباد کی چوڑیاں بھی بہت مشہور تھیں۔ جنھیں جوڑے کہا جاتا تھا۔ یہ

چوڑیاں طرح طرح کے رنگین نگوں سے بنتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میری بہن کی سہیلی کی شادی ہوئی اور وہ نگوں کا جوڑا پہن کر اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان گئی تو وہاں ایک آدمی یہ سمجھ کر اُس کے پیچھے لگ گیا تھا کہ وہ ہیرے کی چوڑیاں ہیں! یہ نگ جرمنی سے آتے تھے اور بالکل ہیرے کی طرح چمکتے تھے۔ یہ چوڑیاں اب بھی بنتی ہیں لیکن اُتنے چمک دار نگ اب نہیں ملتے۔

حیدر آباد کے اُس کلچر میں اِس طرح کی بہت ہی خوبصورت، دلچسپ اور رومانٹک باتیں تھیں مثلاً لڑکیاں سر دھو کر اگر بڑیوں (مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں جو انتہائی خوشبودار ہوتی تھیں) کو انگاروں پر ڈال کر اُس کا دھواں بالوں میں لیتی تھیں۔جس کی خوشبو ایک ہفتے تک سر میں بسی رہتی تھی۔ دھواں لینے کے لیے طرح طرح کی سوراخوں والی بانس کی ٹوکریاں بنائی جاتی تھیں جو شادیوں میں بھی دی جاتی تھیں۔

لڑکیاں رنگ برنگے کھڑے دوپٹوں میں بہت حسین لگتی تھیں۔ اُن میں سے آتی ہوئی بھینی بھینی کیوڑے یا خس کی خوشبو اُنھیں دوسری دنیا کی مخلوق بنادیتی تھی۔اُن میں سے میں بھی ایک ہوتی تھی۔مجھے اِن چیزوں سے زیادہ دلچپسی تھی۔میرے کپڑے موگرے، موتیا کے پھولوں اور کیوڑے کے پتوں میں بسے ہوتے تھے۔سوچ سوچ کے اپنے دوپٹوں کو دوسری لڑکیوں کے دوپٹوں سے مختلف بنانا اور خوبصورت کپڑے پہننا میرا شوق تھا۔

کھانے بے حد لذیذ ہوتے تھے۔ بہت اہتمام سے تیار کیے جاتے تھے۔وہاں کے کھانوں میں یوپی اور جنوب کے پکوانوں کی آمیزش ہوتی اور یہ امتزاج کھانے کو دلچسپ بنادیتا تھا۔ بریانی، قورمہ، دم کے کباب، لقمیہ، ٹئی کے

کباب (یہ نام سننے میں اچھا نہیں، لگے گا لیکن وہاں ٹٹی چٹائی کو کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی لوہے کی چٹائی ہوتی ہے جو دہکتے ہوئے کوئلوں پر رکھ دی جاتی ہے۔ گوشت کے مسالہ لگے پارچے اُس پر سینکے جاتے ہیں، جو گرم گرم کھانے پر بہت عمدہ لگتے ہیں۔) بگھارے بیگن، مرچیوں کا کھٹا سالن، ٹماٹر کا کٹ، گوشت کی کڑھی، ماہی قلیہ (گوشت میں مچھلی کا مسالہ ملا کر بنایا جانے والا سالن) وغیرہ بھی ہوتے تھے۔

ہمارے گھر ایک بڑھیا فقیرنی آتی تھی۔ اُس کے بھیک مانگنے کا طریقہ آج تک مجھے یاد ہے۔ اُس کے پاس ایک لکڑی کی گُڑیا تھی جس کے ہاتھ ٹین کے نقشین ٹکڑوں کے تھے۔ وہ گُڑیا کے کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اُن دونوں ہاتھوں کو بجاتی اور گانا گاتی۔ وہ گانا ایسا تھا۔

وہ پیسہ کیسا گیا گے ماں
وہ پیسہ نا جانا تھا
وہ پیسہ ہوتا تو ہیم و منگاتی
میاں کو شیروانی ہوتی
بی بی کو چولی ہوتی
بچے کو ٹوپی ہوتی
باندی کو تھیلی ہوتی
وہ پیسہ کیسا گیا گے ماں
وہ پیسہ نا جانا تھا

وہ پیسہ ہوتا تو گوشت منگاتی

میاں کو بریانی ہوتی

بی بی کو قورمہ ہوتا

بچے کو نلی ہوتی

کتے کو ہڈی ہوتی

وہ پیسہ کیسا گیا گے ماں

وہ پیسہ نا جانا تھا

میری اماں کو چپکے چپکے خیرات اور غریبوں کی مدد کرنے کی عادت تھی۔ ایک بڑھیا ہر جمعرات کو دوپہر کا کھانا کھانے آتی تھی۔ ہم بچے اُس سے بہت چڑھتے تھے کیونکہ بڑھیا بہت ہی بد مزاج تھی۔ میری چھوٹی بہن جس کا نام سردار خانم تھا (اُس کا انتقال ہو چکا ہے)اُس بڑھیا سے بہت جلتی تھی کیونکہ وہ بڑھیا اُس کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر منہ سے چپ چپ کی آواز نکال کر کھاتی تھی۔ کبھی کبھی سردار جل کر کہتی ''تم یہاں کائے کو آتے جی ؟'' تو بڑھیا ڈھٹائی سے جواب دیتی ''آئی، دیتیں کرکو آتیں۔'' (کھانے کو دیتے ہیں اس لیے آتے ہیں)

میری چھ سہیلیاں تھیں۔ آمنہ، شمیم، عطیہ، محسنہ، مہدی اور دلشاد۔ آمنہ مجھے بے حد محبوب تھی کیونکہ وہ انتہائی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مذاق بھی تھی۔ کپڑے بہت ہی اچھے پہنتی تھی۔ اُس کے پاس سے وہی پھولوں اور اگر کی بھینی بھینی خوشبو آیا کرتی تھی۔ آمنہ سے میری دوستی اسکول کے سالانہ جلسے کے ڈرامے میں ہوئی تھی۔ ایک سال میری ٹیچر نے 'عدلِ جہانگیر' ڈرامہ کیا جس میں مجھے جہانگیر کا رول ملا اور آمنہ کو نور جہاں کا۔ آمنہ نور جہاں کے کپڑے پہن کر

بالکل نور جہاں لگتی تھی۔عطیہ کو ایک گاؤں کی لڑکی کا رول ملا۔ عطیہ شاہ نواز، دبلی پتلی گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی بے حد حسین لڑکی تھی۔ وہ آج تک اُتنی ہی دبلی پتلی اور حسین ہے حالانکہ اُس کے بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ خودنانی دادی بن چکی ہے۔مجھے پتہ چلا کہ میری آمنہ کا ابھی کچھ مہینوں پہلے پاکستان میں انتقال ہو چکا ہے۔یہ سن کر آٹھ دن تک مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ انتقال سے ایک سال پہلے ہی پاکستان میں میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ دل کی مریض ہو چکی تھی لیکن ویسی ہی حسین، بڑی بڑی آنکھوں والی، خوبصورت کپڑے پہنے مجھے ملی تھی۔شمیم، اعظم گڑھ سے آئے ہوئے خاندان کی دبلی پتلی، سانولے رنگ کی، نمکین شکل والی لڑکی تھی جو آج تک اُتنی ہی دبلی ہے۔صرف میں ہی اتنی موٹی ہوگئی ہوں ورنہ عطیہ اور شمیم میں بہت کم فرق آیا ہے۔

حیدرآباد میں ایک طرف تو یہ مہکا مہکا رنگین اور خوبصورت سا ماحول تھا تو دوسری طرف غریب لوگوں کی پریشان حالی۔ چھٹیوں میں جب ہم ابا جان کے ساتھ دورے(ٹور) پر جاتے اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرتے تو وہاں کے ہریجنوں (جو دھیڑ کہلاتے تھے)کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا وہ مجھے ڈرا دیتا۔ابا جان کے جوان (چپراسی)ہریجنوں کو زبردستی اُن کے گھروں سے گھسیٹ کر ہمارا کام کرنے کے لیے بیگار میں لاتے مثلاً ٹینٹ لگانا، صفائی کرنا، پانی بھرنا وغیرہ۔ ابا جان چونکہ رشوت نہیں لیتے تھے اس لیے اُن ہریجنوں کے گھر سے کوئی چیز نہیں آتی تھی۔میرے دونوں ماموں بھی محکمۂ ایکسائز میں سب انسپکٹر تھے۔ جب ہم اُن کے ساتھ جاتے تو وہ اُن کے گھر سے مرغیاں، گھی وغیرہ زبردستی منگوالیا کرتے تھے۔ اگر وہ انکار کرتے تو اُن کی خوفناک پٹائی ہوتی۔ ایک بار ایک بوڑھے نے کام کرنے سے

انکار کر دیا تو اُس کی پیٹھ پر پتھر کی سِل رکھ دی گئی تھی۔ میں سہم گئی اور مجھے ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔

شاید اُسی ظلم کے خلاف وہاں تلنگانہ موومنٹ نے جنم لیا تھا جو کئی وجوہات کی بنا پر کامیاب نہیں ہوسکی۔ میں نہیں سمجھتی کہ اب وہاں اتنا ظلم کوئی برداشت کرتا ہوگا۔

حیدر آباد میں حال یہ تھا کہ جنگوں (نواب اور اُمرا کو دیے جانے والے القاب) کی شادی بیاہ میں جہاں نظام سرکار آتے تھے وہاں چودہ سال سے لے کر چوبیس سال تک کی لڑکی کو اندر چھپا دیا جاتا تھا کہ کہیں سرکار کی نظر نہ پڑ جائے۔ اگر اُنھیں لڑکی پسند آجاتی تو اُسے زبردستی اُن کے حرم میں داخل ہونا پڑتا۔ اسی طرح اُس زمانے میں کوئی یار جنگ کے صاحبزادگان تھے جو انتہائی عیاش اور آوارہ تھے۔ راستوں سے خوبصورت لڑکیوں کو اُٹھا کر لے جاتے۔ اس کی سزا نظام سرکار نے (جنھیں اعلیٰ حضرت بھی کہا جاتا تھا) اُن آوارہ لڑکوں کے والد کو پھولوں کی بیڑیاں پہنا کر دی تھی۔

ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں اور میری بڑی آپا لیاقت خانم اور میرے چھوٹے بھائی جان (جو مجھ سے دو سال بڑے تھے) بڑی آپا جان کی سہیلی شاہ جہاں کے پاس سے کُھلے تانگے میں گھر آرہے تھے۔ بڑی آپا جان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت کپڑوں میں بے حد حسین لگ رہی تھیں۔ راستے میں اُنھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب (جو ہمارے دوست بھی تھے) سے ملتے چلیں۔ وہ جگہ ساگر ٹاکیز سنیما ہاؤس کے پاس تھی۔ وہاں ذرا اندھیرا سا تھا۔ چھوٹے بھائی جان تانگے سے اُتر کر اندر ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے گئے۔ میں اور آپا جان تانگے میں ہی تھے کہ ایک کار ہمارے تانگے کے قریب آکر رکی۔ اُس میں سے ایک صاحب

جو سیاہ شیروانی پہنے ہوئے تھے، اُتر کر ہمارے قریب آئے۔ بڑی آپا جان سے کہنے لگے ''چلیے۔'' بڑی آپا جان نے پوچھا ''کہاں؟'' بولے ''صاحب بلا رہے ہیں۔'' میں کانپ گئی کیونکہ اُس زمانے میں اسکول میں روز لڑکیوں میں ان ہی جنگ کے بیٹوں کا چرچا ہوتا رہتا تھا کہ آج فلاں لڑکی کو اُٹھا لے گئے، پرسوں فلاں لڑکی کو املی کے پیڑ سے باندھ کر چار آدمیوں نے ریپ کیا، وہ لڑکی مر گئی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے آپا جان سے کہا '' یہاں سے فوراً چلیے۔ یہ جنگ کے بیٹے ہیں۔'' پھر اُن کا ہاتھ پکڑ کر بھاگی۔ اُس گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا۔ گاڑی اور ہم دونوں کے بیچ میں ایک یا دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ ہم دوڑ کر ڈاکٹر صاحب کے دوا خانے میں گھس گئے۔ چھوٹے بھائی جان، جو مشکل سے اُس وقت سولہ سال کے رہے ہوں گے، باہر نکلے۔ گاڑی تھوڑے سے فاصلے پر رک گئی تھی۔ بھائی جان ایک نڈر پٹھان، غصہ میں آگ بگولہ ہو گئے۔ کار میں سر ڈال کر پوچھا '' آپ میں سے کس نے کہا چلیے؟ شریف بہو بیٹیوں کو چھیڑتے ہوئے آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔؟'' اُن میں سے ایک آدمی نے ذرا بن کر کہا ''ارے نہیں صاحب، ہم نے تو کچھ نہیں کہا بلکہ ہم تو خود مدد کرنے آرہے تھے۔ وہ خواتین ادھر سے بھاگ کر جا رہی تھیں۔ کہیں کار سے ٹکر لگ جاتی تو؟''

ہم وہاں سے اپنے گھر جانے کی بجائے مَلَک پیٹ اپنے دوستو ، کے گھر چلے گئے تاکہ اُن لوگوں کو ہمارے گھر کا پتہ نہ چل سکے۔ وہ گاڑی ملک پیٹ تک ہمارا پیچھا کرتی رہی پھر چلی گئی۔

جب اعلیٰ حضرت شام کو تفریح کے لیے نکلتے تو جہاں جہاں سے اُن کی گاڑی گزرتی وہاں وہاں لوگوں کو ساکت کھڑا ہو جانا پڑتا تھا۔ گاڑیاں، رکشے،

سائکلیں، انسان ہر چیز ساکت ہو جاتی تھی۔ ہم بچوں کو سکھایا جاتا تھا کہ اعلیٰ حضرت جب گزریں تو اپنی نگاہیں نیچی رکھنا ورنہ اندھے ہو جاؤ گے۔

ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک نوجوان لڑکا موٹر سائکل پر تھا۔ 'اعلیٰ حضرت' کی سواری گزرنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اُس نے سوچا ''صرف یہ سڑک ہی تو پار کرنی ہے۔ جلدی سے گزر جاؤں گا۔'' اور وہ پولس کی سیٹیوں کے باوجود تیزی سے سڑک پار کر کے ایک گلی میں گھس گیا۔ اُسی وقت حضور کی سواری گزری۔ بیگم صاحبہ نے اُس لڑکے کو دیکھ لیا۔ فوراً گاڑی رکوائی اور آرڈر دیا کہ جتنے گلی کے بچے ہیں سب اُس لڑکے پر تھوکیں۔ بچوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ لڑکا اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا اور اُس نے خودکشی کر لی۔ دوسرے دن گنڈی پیٹ کے تالاب میں اُس کی لاش ملی۔

زندگی آگے بڑھتی رہی اور ہم بچے بڑے ہوتے گئے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ بڑے بھائی کی بھی شادی لوہاری میں اپنی پھوپھی زاد بہن، نفیس خانم، سے ہو گئی جو بے حد خوبصورت ہیں۔ ابا جان کا تبادلہ ترقی کے ساتھ اورنگ آباد میں ہو گیا اور ہم سب بچے اورنگ آباد شفٹ ہو گئے۔ اب ابا جان محکمہ ایکسائز کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ شاندار کوٹھی، گاڑی، ٹیلیفون، بارہ جوان (چپراسی)۔ اُس وقت میں میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔

میری منجھلی بہن ریاست خانم کی شادی اختر حسن سے ہوئی۔ اختر بھائی اُس وقت حیدرآباد میں اُردو 'پیام' (ڈیلی پیپر) کے اڈیٹر تھے۔ خود ترقی پسند شاعر اور ادیب بھی تھے۔ اُن کا گھر ہمیشہ ترقی پسند تحریک کا گہوارہ بنا رہتا تھا۔ مخدوم محی الدین بھی وہاں آیا کرتے تھے۔ تمام ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی

مہمان نوازی بہت ہی پیار سے کرتے تھے۔ چھوٹی آپا جان ہمیشہ اُن کا ساتھ دیا کرتی تھیں۔

فروری 1947 میں حیدر آباد میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہونا طے پائی تھی۔اختر بھائی نے باجی (اختر بھائی کی بڑی بہن) کے یہاں کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری کو ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا۔ اُن ہی کے گھر سے ملا ہوا اختر بھائی کی چھوٹی بہن رابعہ برنی کا گھر تھا۔ وہاں سردار جعفری کو ٹھہرایا گیا تھا اور اُن کی دوست سلطانہ آپا کو بھی جو بعد میں سردار بھائی کی بیوی بنیں۔

اُنھیں دنوں میں اورنگ آباد سے چھوٹی آپا جان کو ملنے حیدرآباد آئی ہوئی تھی اور اُنھیں کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی اور یہی میری زندگی کا اہم موڑ بھی ثابت ہوا۔وہیں میں نے پہلی بار ان ترقی پسند ادیبوں کو دیکھا جن کے چرچے سنتی آئی تھی۔پہلی بار ایسے لوگوں سے ملی جو اتنی شہرت پانے کے باوجود اتنے سادہ اتنے ملنسار اور انسان دوست تھے۔ دماغی طور پر اتنے بلند اور اونچے خیالات کے حامی لیکن اُتنے ہی سادہ مزاج اور اُن کے لباس بھی انتہائی سادہ۔

حیدر آباد کا کلچر تو یہ ہوتا تھا کہ ذرا سا امیر آدمی ہو کہ ذرا سا شہرت یافتہ ادیب یا شاعر(سوائے مخدوم محی الدین کے)اپنے سے کمتر لوگوں سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔

رات کو مشاعرہ تھا۔ میں اور میرے بڑے بھائی جان، جو اُس وقت ایل.ایل .بی .میں پڑھ رہے تھے، مشاعرہ سننے کے لیے گئے۔ ہم ہال میں سامنے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بہت دیر تک سوچنے کے بعد بہت ہی خوبصورت کپڑے پہن رکھے تھے۔سفید کارگے کا کُرتہ، سفید شلوار اور بہت ہی محنت سے رنگا

ہوا قوسِ قزح کے رنگوں کا دوپٹہ۔ پیر میں سنہرے رنگ کا سلیم شاہی جوتا۔ اپنی دانست میں میں سب پر چھا جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب کیفی نے پڑھنا شروع کیا تو میں مبہوت ہو کر اُنھیں دیکھنے لگی۔ دراز قد دبلا پتلا پُرکشش نوجوان اور آواز خدا کی پناہ، اتنی گھن گرج۔ نظم کا عنوان تھا ''تاج۔'' اعلیٰ حضرت کے شہر میں اُنھیں کے تاج کے خلاف اتنی طاقتور نظم۔ میں نے بڑے بھائی جان کو دیکھا اور اُنھوں نے میری طرف۔ بھائی جان کہنے لگے'' اِس عمر میں اتنی بے باک نظم، اِن لوگوں کا مقصد بہت اعلیٰ ہے۔''

مشاعرہ ختم ہوا تو لوگوں کا ہجوم کیفی اعظمی، سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری کی طرف آٹوگراف بک لے کر لپکا۔ کیفی کے چاروں طرف کالج کی لڑکیاں مکھیوں کی طرح جمع ہوگئیں۔ میں نے ایک طائرانہ نظر کیفی پر ڈالی اور سردار جعفری کی طرف مڑ گئی۔ اُن سے آٹوگراف لے لیا۔ پھر جب بھیڑ بھاڑ کم ہوئی تو میں نے ایک ادا سے، کافی خود اعتمادی کے ساتھ، اپنا آٹوگراف بک کیفی کی طرف بڑھا دیا۔ کیفی نے اِتنے ہجوم میں بھی کن انکھیوں سے مجھے سردار جعفری کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے آٹوگراف بک پر انتہائی مہمل شعر لکھ دیا، جو اِس طرح تھا۔

وہی ابرِ ژالہ چمک نُما وہی خاکِ بلبلِ سرخ رو ذرا راز بن کے مہن میں آؤ
دلِ گھنتا تُن تو بجلی کڑکے دُھن تو چھبن جھپٹ کے لگن میں آؤ

جبکہ ذکیہ میری دوست اور اختر بھائی کی چھوٹی بہن کے آٹوگراف بک پر ایک نہایت اچھا شعر لکھا تھا۔ ذکیہ تو بہت خوش ہوگئی لیکن میں جل کر کوئلہ ہوگئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں کیفی کے ساتھ چلنے لگی، میں نے ناراضگی سے پوچھا'' آپ نے اتنا خراب شعر میرے آٹوگراف بک پر کیوں

لکھا ؟''تو کیفی شرارت سے مسکرائے اور کہا '' آپ نے پہلے جعفری صاحب سے آٹوگراف کیوں لیا؟''میں کِھلکِھلا کر ہنس پڑی اور میرا غصہ رفو چکر ہو گیا۔

ہم لوگ گھر کی کچھ سیڑھیاں چڑھ کر سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگے۔ چھوٹی آپا جان کو شاید شک ہو گیا وہ آئیں اور اُنھوں نے کہا'' چلو کھانا لگ گیا ہے اور ہاں کیفی تم شوکت کو مبارکباد دو کیونکہ تین مہینے بعد ان کی شادی ہمارے ماموں زاد بھائی عثمان سے ہو جائے گی۔''

میں نے دیکھا کہ کیفی کا چہرہ ایک دم اُتر گیا۔ ہم اُٹھ کر کھانا کھانے چلے گئے۔میں نے سردار جعفری سے سن رکھا تھا کہ کیفی کی شادی بمبئی میں کسی خاتون کے ساتھ ہونے والی ہے اور وہ کیفی کے لیے اورنگ آباد سے ہیمرو کی شیروانی خریدنے والے ہیں۔

کھانا کھا کر میں اور کیفی پھر اُنھیں سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئے۔کیفی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔''تین مہینے بعد تو آپ کی شادی ہو جائے گی۔ پھر آپ کو تو ہم یاد بھی نہیں رہیں گے۔''

میں نے کہا'' آپ بھی تو بمبئی جا کر شادی کر لیں گے۔''

کیفی نے فوراً کہا'' اب میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔''

پھر میں نے اُنھیں بڑی بوڑھیوں کی طرح سمجھانا شروع کیا کہ'' شادی ضرور کرنی چاہیے۔ شادی کے بغیر زندگی ادھوری رہ جاتی ہے۔ انسان مکمل نہیں ہوتا'' وغیرہ وغیرہ۔

وہ میری طرف دیکھنے لگے۔میں نیچے دیکھنے لگی اور چپ چاپ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔اُس رات مشکل سے نیند آئی تھی۔

صبح کو اُٹھ کر، نہا دھوکر، تیار ہو کر کیفی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ نہا کر نکلے تھے۔ پینٹ شرٹ، لمبے لمبے گیلے بال۔ میں والہانہ انداز سے آئی اور اُنھیں سینٹ لگا کر بھاگ گئی۔ اُس زمانے میں evening in paris کا بہت فیشن تھا۔ کیفی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں میرا پیچھا کرتی رہیں۔ پھر یہ لوگ میٹنگ میں چلے گئے۔ شام کو کیفی سردار بھائی کی طرف ہی جا کر سو گئے۔ رات کو اختر بھائی نے سب شاعروں اور ادیبوں کو اپنے گھر پر دعوت دے رکھی تھی۔ میں اور ذکیہ شام ہی سے اپنے بہترین کپڑے پہن کر اِدھر اُدھر اِتراتے پھر رہے تھے۔ رات کے آٹھ بج گئے، کیفی نہیں آئے۔ ذکیہ نے کہا کیفی رابعہ آپا کے گھر جا کر سو گئے ہیں۔ میں نے کہا ''جاؤ تم اُٹھا لاؤ'' ۔ذکیہ نے کہا ''میں کیوں اُٹھاؤں۔'' میں نے دل میں کہا میں بھی کیوں اُٹھاؤں۔تھوڑی دیر میں دیکھا کہ کیفی چلے آرہے ہیں۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ وہیں ٹھنڈے پانی کی صراحی اور قلعی دار نقشین کٹورہ اُس پر ڈھکا ہوا تھا۔ کیفی سیدھے میری طرف آگئے اور کہنے لگے ''بہت پیاس لگی ہے۔''

میں نے صراحی سے پانی نکالا اور کٹورہ بھر کر دے دیا۔

کہنے لگے ''اور''

میں نے اور دیا۔

وہ ''اور''

میں نے اور دیا

''اور''

میں سوالیہ آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

بولے '' پیاس نہیں بجھی۔''

میں شرما کر دوسری طرف بھاگ گئی اور میری نگاہوں میں ساری دنیا رنگوں سے بھر گئی۔

پھر تمام شاعر بیچ کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سفید چاندنی کا فرش، گاؤ تکیے لگے ہوئے، موگرے کے پھول نقشین چاندی کی طشتری میں سجے ہوئے جگہ جگہ رکھے گئے تھے۔ خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ مجروح، کیفی اور سردار جعفری کے ساتھ ساتھ حیدر آباد کے شاعر بھی جمع تھے۔ مجروح نے اپنی دلنواز آواز اور خوبصورت ترنم میں یہ غزل پڑھی:

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

خوب تالیاں بجیں، واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ پھر سردار بھائی نے ایک ادا سے اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر ایک جھٹکے سے بال پیچھے کئے، اپنی بھاری اور مقناطیسی آواز میں کہا، ''آج کل میں ایک طویل نظم مثنوی کی شکل میں کہہ رہا ہوں''

'نئی دنیا کو سلام' اُس کے آخر کا ایک حصہ سناؤں گا۔

کاروانِ حیات

یہ آدمی کی گزر گاہ، یہ کاروانِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے

گزرتے وقت کے گردو غبار کے نیچے
حسین جسم کی، تابندگی چھپائے ہوئے
گذشتہ دور کی تہذیب کی منازل کو
جوان ماں کی طرح گود میں سُلائے ہوئے
نئے اُفق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لَو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کے سپہ، انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے
اُٹھو اور اُٹھ کے انہیں قافلوں میں مل جاؤ
جو وقت کو بھی ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے

اِس نظم نے مجھے چونکا دیا ''اُفوہ یہ لوگ کتنے پڑھے لکھے ہیں بلکہ فلسفی بھی۔'' اِس میں شک نہیں کہ کیفی اعظمی کی پُرکشش شخصیت نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا لیکن ان سب کے نصب العین نے میری معصوم زندگی میں ہلچل مچا دی تھی۔ شعور کی روشنی کی جگمگاہٹ کی ہلکی سی کرن میرے دماغ سے دل میں اُتر گئی۔ اِن کی دنیا میرے لیے کسی جادونگری سے کم نہیں تھی۔

اِس سے پہلے ہم صرف شفیق الرحمٰن، عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی کو پڑھا کرتے تھے۔ اور مخدوم کی ایک غزل ۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

ہماری بہت ہی پسندیدہ غزل تھی۔

پھر 'عورت' نظم کی فرمائش ہونے لگی۔ اُس زمانے میں کیفی سے ہر مشاعرے میں 'عورت' نظم اور ساحر سے 'تاج محل' نظم کو سنے بغیر اُنھیں جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اس نظم کی بہت تعریف سن رکھی تھی اور نظم سننے کے لیے بے چین تھی۔ کیفی پورے اعتماد کے ساتھ سامنے آئے۔ اپنے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ جلائی، بال پیچھے کیے اور نظم شروع کی :

قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اُسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کُھلنے میں ہے نکہت، خمِ گیسو میں نہیں
جنت ایک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اُس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشے گوشے میں سلگتی ہے چِتا تیرے لیے
فرض کا بھیس بدلتی ہے فضا تیرے لیے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لیے
زہر ہی زہر ہے دنیا کی ہوا تیرے لیے
رُت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تُو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کر رسم کے بت، بندِ قدامت سے نکل
ضعفِ عشرت سے نکل، وہمِ نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گُل بھی کچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن سلسلۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
طوق یہ بھی ہے زمرد کا گُلو بند بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردانِ خردمند بھی توڑ
بن کے طوفان چھلکنا ہے، اُبلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تُو فلاطون و ارسطو ہے، تُو زہرا پرویں
ترے قبضے میں ہے گردوں، تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اُٹھا جلد اُٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رُکنے کا نہیں، وقت بھی رکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

میں کیفی کو ایک ٹک ایسے دیکھے جارہی تھی جیسے یہ نظم اُنھوں نے میرے لیے ہی کہی ہو اور میں ہی اُن کے ساتھ چلنے کی حق دار ہوں۔ خوشی میرے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اِس نظم کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ لوگوں نے کتنی تالیاں بجائیں، کتنی واہ واہ ہوئی، میں اپنی ہی دنیا میں کھوگئی تھی۔ اپنا پورا کردار میرے سامنے

آ گیا۔ خودسر، خوددار، آزاد خیال، غلط بات کے خلاف آواز اُٹھانے والی۔

ابا جان جب حیدر آباد سے اورنگ آباد شفٹ ہوئے تھے تب میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ میں اور میری چھوٹی بہن، سردار خانم، میرے چھوٹے بھائی جان اور ایک نوکرانی حیدرآباد میں رہ گئے تھے، کیونکہ ہمارے امتحان چل رہے تھے۔ امتحان کے بعد ہم تینوں بہن بھائی کو اورنگ آباد جانا تھا۔ چھوٹے بھائی جان ذرا پرانے خیال کے تھے۔ بہنوں کو بے پردہ اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے کہا" میں تم دونوں کو صرف اِس شرط پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا کہ تم دونوں برقعہ پہنو۔"ہم دونوں کے پاس تو کیا میری بڑی بہنوں کے پاس بھی برقعہ نہیں تھا۔ میں فوراً اکڑ گئی" میں ہرگز برقعہ نہیں پہنوں گی۔ میرے پاس برقعہ ہے بھی نہیں۔" مگر میری چھوٹی بہن سردار جو گائے کی طرح نیک تھی، فوراً تیار ہوگئی اور کہنے لگی"بھائی جان میرے پاس برقعہ تو نہیں ہے البتہ میں چادر اوڑھ کر آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

میں نے کہا"میں چادر بھی ہرگز ہرگز نہیں اوڑھوں گی۔ آپ سردار کو لے جایئے۔ جب ابا جان آئیں گے تو اُنھیں کے ساتھ جاؤں گی۔"

بھائی صاحب بھی ایک ضدی، مجھے چھوڑ کر صرف سردار کو لے کر چلے گئے اور میں اُس وقت تک ایک نوکرانی کے ساتھ اکیلی رہی جب تک ابا جان آکر نہ لے گئے۔ اکثر جب میں ماں سے کسی بات پر ناراض ہوجاتی تو تین تین دن تک کھانا نہیں کھاتی تھی۔ صرف میرے ابا مجھے سمجھا بجھا کر پیار سے کھانا کھِلاتے تھے۔

کیفی کی نظم سننے کے بعد میں نے سوچا عورت کے بارے میں اِس طرح سوچنے والا شخص ہی میرا شوہر ہو سکتا ہے۔ پرانے خیال کے کسی آدمی کے ساتھ میرا گزر نہیں ہو سکتا۔

O

اورنگ آباد

مشاعرے اور کانفرنس کے خاتمے کے بعد اختر بھائی نے یہ طے کیا کہ سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی اور سلطانہ آپا کو اورنگ آباد لے جائیں گے جہاں میرے ماں باپ بھائی بہن پہلے سے ہی موجود تھے۔ اختر بھائی نے کہا وہاں ایک مشاعرہ ہوگا پھر انھیں اجنتا ایلورہ کی سیر کرائی جائے گی۔ چنانچہ ہم سب بغیر ریزرویشن کے گاڑی میں چڑھ گئے۔ حیدر آباد سے اورنگ آباد تین سو میل دور ہے۔ایک رات کا سفر۔ ڈبے میں بڑی بھیڑ تھی۔ کچھ لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ ملی اور کچھ کھڑے رہے۔میں، کیفی، اختر بھائی اور ذکیہ کھڑے رہے۔ باقی سب کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی تھی۔ میں کیفی سے کافی دور کھڑی تھی۔ اتنے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ رکی اور میں اُس جھٹکے سے سیدھی کیفی پر گری۔کیفی نے مجھے پھولوں کی طرح سنبھال لیا۔ میں شرما کر جلدی سے واپس اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی لیکن لوگوں میں ہلکی ہلکی چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں جس کی میں نے پرواہ بھی نہیں کی۔

اورنگ آباد میں ابا جان اور میرے سارے بہن بھائی ہمارے قافلے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کو آرام سے ٹھہرا دیا گیا، خوب اچھا کھانا کھایا۔ ہمارے پاس ایک گاڑی تھی۔ دوسری گاڑی ابا جان نے اپنے دوست سے منگوا لی تھی۔

اورنگ آباد کے مشاعرے کے بعد ایلورا اجنتا دیکھنے کا پروگرام بنا۔ میں جان بوجھ کر ایسی گاڑی میں بیٹھی جس میں کیفی بیٹھے تھے۔ اُسی گاڑی میں مجروح، سردار بھائی اور سلطانہ آپا بھی تھے۔ اورنگ آباد سے اجنتا ساٹھ میل دور ہے۔ کیفی اور سردار بھائی اگلی سیٹ پر تھے۔ میں، سلطانہ آپا اور مجروح پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ راستے میں مجروح اور کیفی نے خوب ہنسایا۔ کیفی مسلسل پرانے لکھنو کے شعرا کی نقلیں اُتار رہے تھے اور مجروح گانوں کی پیروڈی بنا بنا کر ہنسا رہے تھے، مثلاً

جاؤ گے جانے نہ دونگی
پیچھے کتے چھوڑ دونگی
دونوں آنکھیں پھوڑ دونگی
دونوں ٹانگیں توڑ دونگی

وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ کیفی شاعروں کی نقلیں پوری ایکٹنگ کے ساتھ کر رہے تھے۔ کبھی کبھی گردن گھما کر، نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھنے بھی لگتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کیفی میں ایکٹنگ کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے اور وہ بہت ہی پُرکشش انسان ہیں۔

اجنتا میں سب لوگ اُتر گئے۔ میں کیفی سے دور دور ہی رہی کیونکہ وہاں مجھ پر چھوٹی آپا جان کی بڑی سخت نگرانی تھی۔ دوسرے دن ہم سب 'پن چکی' اور 'بی بی کا مقبرہ' دیکھنے گئے جو اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ اعظم شاہ نے اپنی والدہ دلرس بانو بیگم رابعہ دُرّانی کے لیے بنوایا تھا۔ تاج محل کی کاپی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مکمل عمارت سنگِ مرمر کی نہیں ہے۔

میں نے دیکھا کہ کیفی ایک درخت کے نیچے تنہا اور اُداس کھڑے ہیں۔

دوسرے لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے میں مصروف تھے۔ میں چپکے سے کیفی کے پاس آ کے کھڑی ہوگئی۔ کیفی نے اُداس لہجے میں کہا ''ہم دو چار دن میں چلے جائیں گے پھر آپ سے ملاقات بھی نہیں ہوگی۔ ویسے بھی آپ دور دور ہی رہنے لگی ہیں۔ ''میں چپ رہی۔ اپنے انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی۔ بار بار آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے جنھیں دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

کیفی کہنے لگے ''اگر آپ اجازت دیں تو ایک نظم آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے سر جھکائے جھکائے گردن ہلا دی۔ کیفی نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے نظم شروع کی۔ نظم کا عنوان ہے؛

تم

شگفتگی کا لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصلِ بہار ہو تم
جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو
جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تم
حلاوتوں کی تمنا، ملاحتوں کی مراد
غرور کلیوں کا، پھولوں کا انکسار ہو تم
تمہارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
نگاہ چھیڑتی ہے جس کو وہ سِتار ہو تم

اُٹھا سکی نہ جسے جستجو وہ موتی ہو
جسے نہ گوندھ سکی آرزو وہ ہار ہو تم
جسے نہ بُوجھ سکا عشق وہ پہیلی ہو
جسے سمجھ نہ سکا پیار بھی وہ پیار ہو تم
خدا کرے کسی دامن میں جذب ہوں نہ سکیں
یہ میرے اشکِ حسیں جن سے آشکار ہو تم

یہ نظم سننے کے بعد میرے آنسو پاگلوں کی طرح بہنے لگے اور میں وہاں سے بھاگ گئی۔شام تک سارا قافلہ وہیں رہا۔ چائے وغیرہ پی گئی۔ پھر چاند نکل آیا۔ سب نے مل کرایک کھیل سوچا۔ایک آدمی چور بنتا تھا اور اُس کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ایک آدمی کے لیے ایک ایک لفظ میں اُس کا کیریکٹر بتائے۔ دوسرے آدمی کا کام یہ تھا کہ وہ بتائے کہ پہلے آدمی نے کون سا لفظ کس شخص کا کیرکٹر بتانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ مجھے ٹھیک سے یادنہیں کہ وہ کھیل کون جیتا لیکن اتنا یاد ہے کہ کیفی نے میرا نام مقناطیس رکھا تھا۔

تیسرے دن سردار جعفری، سلطانہ آپا اور مجروح سلطان پوری تو واپس بمبئی لوٹ گئے لیکن کیفی ٹھہر گئے۔ میری چھوٹی بہنوں سے اُن کی دوستی ہوگئی تھی۔ ابا جان بھی کیفی کو پسند کرنے لگے تھے لیکن میرے دونوں بڑے بھائی اور چھوٹی آپا جان کو میرا کیفی سے بات کرنا بھی ناگوار تھا۔ ان لوگوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جب بھی میں اور کیفی اکیلے ہوں تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی آکر بیٹھ جائے۔

ایک دن میں نے جلدی سے کھانا کھا لیا اور کیفی کے کمرے میں چلی گئی جہاں وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ گھر والے کھانے میں مصروف تھے۔ میں نے باتوں

باتوں میں کہا ''آپ جا کر بمبئی والی لڑکی سے شادی کر لیجیے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

کیفی کہنے لگے ''میں آپ کی ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں لیکن اگر آپ کہیں کہ میں تیل کی شیشی سے شادی کرلوں تو یہ نہیں ہوگا۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا ''اچھا اپنا ہاتھ دکھایئے۔''

کیفی نے سیدھا ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے اُن کا ہاتھ بڑے پیار سے تھام لیا اور اُن کی قسمت کی لکیریں دیکھنے لگی۔ ایک لکیر پر ہاتھ رکھ کر میں نے کہا:

''آپ کی love marriage ہو گی۔''

''سچ؟'' کیفی میری طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں، یہ جو آپ کی شہادت کی اُنگلی کے نیچے ایک اسٹار سا بنا ہوا ہے نا، وہی اِس کی علامت ہے۔'' میں نے ایک پیپر اُٹھایا اور اُس پر لکھا۔

''زندگی کے سفر میں اگر تم میرے ہم سفر ہوتے تو یہ زندگی اِس طرح گزر جاتی جیسے پھولوں پر سے نسیمِ سحر کا ایک تیز جھونکا۔''

اور یہ پیپر کیفی کی طرف بڑھا دیا۔ کیفی نے پڑھ کر میری طرف دیکھا اور کہا ''میری زندگی کی قسمت اِنھیں آنکھوں میں ہے۔''

پھر لوگ آگئے اور میں وہاں سے اُٹھ گئی۔ پھر یہ ہوا کہ بیچ کے کمرے میں، جہاں سے میں کیفی کے کمرے میں جا سکتی تھی، تالا پڑ گیا اور کیفی سے ملنے کے لیے مجھے بُری طرح سے منع کر دیا گیا۔ اماں جان نے بھی ڈانٹا۔ دوسرے بہن بھائیوں کو مجھے ڈانٹنے کی ہمت نہیں تھی کیونکہ میں بُری طرح جواب دینے میں اُستاد تھی لیکن اماں جان کو میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میری دو چھوٹی بہنیں، جن کے نام قمر اور ظفر ہیں، میری چمچیاں تھیں۔ جب میں پلنگ پر لیٹ کر رونے لگتی تو یہ دونوں بہنیں مجھے چپک جاتیں۔ ''اللہ آپا بی، اگر آپ کی شادی کیفی بھائی سے ہو گئی تو کتنا اچھا لگے گا۔ اتنے بڑے مشہور شاعر، ہم اپنے دوستوں میں شان سے بتائیں گے کہ ہمارے بہنوئی کیفی اعظمی ہیں۔''

پھر مجھے پتہ چلا کہ کیفی روتے ہوئے بمبئی چلے گئے اور مجھے ملنے بھی نہیں دیا گیا۔ شام کا وقت تھا میں پاگلوں کی طرح اُن کے کمرے میں گئی جو بالکل خالی تھا۔ دیوانوں کی طرح اُن کی میز کے کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ میرے پاس اُن کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے۔ اچانک میری نظر ایک رائٹنگ پیڈ پر پڑی۔ جلدی جلدی کانپتے ہاتھوں سے اُس کے ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ بیچ کے پیپر میں ایک انتہائی خوبصورت نظم لکھی ہوئی ملی۔

نیچے بمبئی کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

سینڈھرسٹ روڈ، راج بھون، بمبئی ۲۲۔

ایک دم جان میں جان آگئی۔ میں وہیں کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو نظم پڑھنا شروع کی۔

شوکت کے نام

وہ چاند جس کی تمنا تھی میری راتوں کو
تم ہی وہ چاند ہو اِس چاند سی جبیں کی قسم
وہ پھول جس کے لیے میں چمن چمن میں گیا
تم ہی وہ پھول ہو رخسارِ احمریں کی قسم

تلاش جس کی مری روحِ شاعری کو تھی
وہ سحر و نغمہ اِسی چشمِ کیف بار میں ہے
گُھلی ہوئی ہے گلستاں کی چاندنی جس میں
وہ غنچگی اسی لب میں، اسی عذار میں ہے
لچکتا کانپتا قامت، گھنے گھنے گیسو

مجسمہ ہے تو میرے حسین خوابوں کا

اتنی حسین نظم میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھی تھی مگر افسوس پوری یاد نہیں ہے۔ یہ نظم پڑھتے ہی میں نے وہیں پیڈ لیا اور دیوانوں کی طرح اوپر چھت پر پہنچ گئی اور کیفی کو بے ساختگی سے خط لکھا۔

کیفی مجھے تم سے محبت ہے، بے پناہ محبت۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ پہاڑ، دریا، سمندر، لوگ، آسمان، فرشتے، خدا۔ ۔۔اور پتہ نہیں کیا کیا۔

تمہاری اور صرف تمہاری،
شوکت

نیچے پتہ اپنے چچا زاد بھائی اکبر کے اسکول کا لکھ دیا۔ اکبر میرے مرحوم چچا کا لڑکا تھا جو ہمارے پاس ہی رہتا اور پڑھتا تھا۔ ہمدرد، محبت والا، کیفی کو پسند کرتا تھا اور مجھ سے ہمدردی تھی۔ اُسی نے مجھے رائے دی تھی کہ آپ اپنے خط میرے

اسکول کے پتے پر منگوا سکتی ہیں۔پانچ چھ دن میں ہی کیفی کا جواب آ گیا۔ مجھے اُس خط کا کچھ حصہ آج بھی یاد ہے۔

شوکت میری شوکت،

تمھارا خط ملا۔ اُس کا ایک ایک حرف میرے اندر اِس طرح جذب ہو رہا تھا جیسے پہلی بارش کے قطرے پیاسی زمین میں جذب ہو جاتے ہیں۔

پھر خطوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ روز اکبر مجھے کبھی چھ، کبھی بارہ خط لا کر دیتا۔ مجھ پہ لکھی ہوئی نظمیں ہوتیں اور انتہائی خوبصورت خط۔ میں سب سے چھپ کر چھت پر چلی جاتی اور ایک ایک خط کو پانچ پانچ چھ چھ بار پڑھتی اور خیالوں کی ایک حسین دنیا میں پہنچ جاتی۔ پھر میرے بھی چھ چھ خط روز جانے لگے۔ بعد میں منیش (کیفی کے دوست) نے بتایا کہ کمیون میں خطوں کے لیے ایک بورڈ لگا ہوتا تھا۔ جس پر میرے پورے خط سجا کر لگائے جاتے تھے۔ایک ہینڈ رائٹنگ، ایک ہی رائٹنگ پیڈ پر لکھے ہوئے خط۔کامریڈ شرارت سے کیفی کو خوب چھیڑتے اور ہنستے۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ چاروں طرف سے پابندیاں لگنے لگیں۔ گھر میں میرے ابّا جان اور دو چھوٹی بہنوں کے علاوہ کوئی میرا طرفدار نہیں تھا۔اکبر کی وجہ سے کیفی کے خط تو مجھے مل جاتے لیکن میرے خط کیفی تک نہیں پہنچتے کیونکہ چپراسی تو سب بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی جان کی طرف تھے لیکن کا ماٹن (بائی جو گھر میں جھاڑو برتن کرتی ہے) میری طرفدار تھی۔ میں اُسی کے ذریعے خط بھیجتی تھی۔ وہ گیہوں پسوانے والے ڈبے میں بند کر کے لے جاتی یا کبھی

سودا لانے والی بھٹی (ٹوکری یا باسکٹ) میں اخبار رکھ کر اُس کے نیچے میرے خط رکھ کر لے جاتی تھی۔ میرے بھائیوں کو پتہ چل گیا۔ بس میرے خط اُس سے لے کر پھاڑ دیئے جاتے۔

گھر میں ایک ہنگامہ تھا۔ میرا ماموں زاد بھائی آ گیا تھا۔ کبھی وہ میرے ابا جان کا ریوالور نکال لیتا کہ میں اپنے آپ کو شوٹ کر لوں گا۔ ایک بار نیلا تو تا کھالیا۔ بھائی جان وغیرہ اسپتال لے گئے۔ وہاں اُس کا علاج ہوا، ٹھیک ہوگیا۔

جب پندرہ بیس دن گزر گئے اور میرے خط بمبئ نہیں پہنچے تو کیفی بے چین ہوگئے۔ (وہ سمجھے کہ میں خفا ہوگئی ہوں) اُنھوں نے اپنے خون سے ایک خط لکھا۔ جسے دیکھ کر میں پاگل سی ہوگئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے ابا جان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں صرف کیفی سے شادی کروں گی ورنہ کسی سے نہیں اور وہ خون سے لکھا ہوا خط ابا جان کو دِکھا دیا۔

(وہ خط آج بھی میرے پاس ہے۔)

۲۱ مارچ شب

ایک بجے تم کو ایک خط لکھ کے لفافہ بند کیا اور لیٹا کہ شاید سو جاؤں لیکن نیند نہیں آئی۔ پھر تمھارا خط پڑھا اور بے اختیار آنسو نکل آئے۔ شوکت تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں، میری محبت پر اعتبار نہیں ؟ یہ میری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے ؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کو اپنی محبت کا کیسے یقین دلاؤں۔ پھر ایک بات سمجھ میں آئی۔ بلیڈ لے کر اپنی کلائی کے اوپر ایک گہرا سا زخم ڈالا اور خون سے تم کو خط لکھ رہا ہوں۔ اب تک تمھاری محبت میں آنسو بہائے تھے اب خون، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

موتی (میرا گھریلو نام) مجھے بڑا رنج ہے کہ تم نے یہ فقرے مجھ کو کیوں لکھے، ''میں نے دیکھا اُس کی نگاہیں میری طرف نہیں ہیں بلکہ وہ اور کسی نسوانی پیکر کو اشارہ کر رہا ہے جو اُس کا مطلب نہیں سمجھ رہی ہے یا سمجھنا نہیں چاہتی''

شوکت یہ الفاظ واپس لے لو۔ میری محبت کی توہین نہ کرو۔ اگر تم میرے لیے کچھ کر نہیں سکتیں تو نہ سہی، میں نے تم سے محبت جب کی تھی تو کون سی اُمید تھی۔ میرا اور میری محبت کا خدا مالک ہے۔ رہ گیا یہ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں اور تم سے شادی کروں گا یا نہیں، یہ تم بھی دیکھ لوگی اور دنیا بھی۔

میری شوکت مجھے بتاؤ کہ میرا اور میری محبت کا کیا حشر ہوگا۔ میں تم سے اتنی دور ہوں کہ تم کو میری حالت معلوم نہیں اور دوسرے لوگ جو کہہ دیں تم مان لیتی ہو۔ تم کو میری مجبوریوں پر ترس بھی نہیں آتا۔ کوئی بات ناگوار ہو تو معاف کر دینا۔

بہت بہت پیار

تمہارا

کیفی

خط پڑھ کر ابا جان مسکرائے (ہم بہن بھائیوں کا رشتہ ابا جان سے دوستوں کا سا تھا) کہنے لگے ''بیٹے، یہ شاعر لوگ بڑے رومانٹک ہوتے ہیں۔ اصلی زندگی اور اُن کی شاعری میں بڑا فرق ہے۔ یہ لکھیں گے کہ میں آپ کی یاد میں پتھروں سے اپنا سر پھوڑ رہا ہوں اور اپنے خون سے خط لکھ رہا ہوں حالانکہ حقیقت میں وہ ایک درخت کے نیچے لیٹے ٹھنڈی ہوا کھا رہے ہوں گے اور بکری کے خون سے خط لکھ رہے ہوں گے۔ خیر، میں آپ کو بمبئی لے چلوں گا وہاں آپ اپنی آنکھوں

سے اُن کی زندگی دیکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے۔"

اُدھر کیفی کو میرے خط نہیں مل رہے تھے۔اُن کی بُری حالت تھی۔ روتے روتے بُرا حال۔ پارٹی میں سب کو اُن پر رحم آ گیا، خاص طور سے کامریڈ مرزا اشفاق بیگ کو، جو وکیل اور پارٹی کے ہول ٹائمر تھے اور انگلش اخبار نیو ایج میں کام کرتے تھے۔ ایک دن لکھتے لکھتے وہ اپنا قلم بند کر کے پی سی جوشی کے پاس گئے، جو اُس وقت پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔اُن سے اجازت لے کر سیدھے اورنگ آباد پہنچے اور ابا جان کے دفتر میں چپراسی کو بتایا کہ وہ سی.آئی.ڈی کے آفیسر ہیں اور ابا جان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابا جان نے فوراً دفتر میں بلا لیا، پھر اُنھوں نے آہستہ آہستہ اپنی اصلیت بتائی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا باتیں ہوئیں، صرف اتنا پتہ چلا کہ ابا جان اندر آئے اور میری ماں سے کہا "کھانا ذرا اچھا پکواؤ میرے ایک عزیز مہمان آئے ہوئے ہیں۔" یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرزا اشفاق بیگ نے ابا جان کو میری شادی کیفی سے کرنے کے لیے راضی کر کے ہی چھوڑا۔

ابا جان اُسی رات اماں جان سے کہہ رہے تھے "بی بی ہم اور تم ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں ہیں۔ اگر اس کی شادی ایسے لڑکے سے کر دیں گے جسے وہ نہیں چاہتی تو وہ شادی کے تیسرے مہینے ہمارے گھر واپس آ جائے گی۔ جب ہم اور تم نہیں رہیں گے تو وہ کہاں جائے گی۔ اُس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ لیکن ہم اگر اس کی شادی کیفی سے کر دیتے ہیں تو یہ انتخاب چونکہ اُس کا ہوگا اور وہ اُس کی ذمہ دار ہوگی، چاہے بنے یا بگڑے، وہ ہم سے شکایت نہیں کرے گی اور خود ہی اُس زندگی کو نبھائے گی۔" اماں جان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سنتی رہیں۔ بعد میں ابا جان چپکے سے مجھے کہنے لگے "بمبئی چل کر آپ خود فیصلہ کیجیے

کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔ اگر آپ کو اُن کی زندگی پسند آئی تو میں آپ کی وہیں شادی کر دوں گا، ماں اور بہن بھائیوں کو بتائے بغیر۔"

میں یہ سن کر خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور تیار ہو گئی۔ ابا جان نے گھر والوں کو بتایا " موتی چونکہ بہت پریشان ہے اِس لیے میں اُسے اپنے ساتھ ٹور پر لے جا رہا ہوں تا کہ وہ اطمینان سے اپنا برا بھلا سوچ سکے۔ اماں جان نے باورچی خانے کا سامان صندوق میں رکھنا چاہا تو ابا جان نے منع کر دیا اور کہا "کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم دو ایک دن میں واپس آجائیں گے۔" بمبئی کے ٹکٹ چپراسی سے منگوا لیے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں گھر سے نکلنے لگی تو گھر کو ایک بار آنسوبھری آنکھوں سے دیکھا اور یہ مصرع پڑھا۔ ع

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

O

بمبئی

جب بمبئی اسٹیشن قریب آنے لگا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ کارخانوں کا دھواں،لوکل ٹرینوں کی خوفناک آوازیں، اسٹیشنوں کی گندگی، میلے کچیلے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ، میں نے ابا جان سے کہا" یہاں یہ لوگ بغیر آکیسجن کے زندہ کیسے رہتے ہوں گے۔"

حیدر آباد اور اورنگ آباد کے بعد میں پہلی بار بڑے شہر میں آرہی تھی (ہاں ایک بار میں دہلی ہوتے ہوئے اپنے آبائی وطن سہارنپور لوہاری بھائی جان کی شادی میں گئی تھی، لیکن اُس کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا)۔بوری بندر اسٹیشن پر اُتر کر ہم سیدھے 'سی ویو' ہوٹل گئے۔ سامان رکھا۔ میں نے نہا دھو کر اچھے کپڑے پہنے۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔تھوڑی دیر آرام کر کے پانچ بجے کے قریب سیدھے سینڈھرسٹ روڈ، راج بھون،پارٹی آفس پہنچے۔ ابا جان اوپر گئے، میں ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔ میں نے دیکھا ابا جان کے ساتھ ایک خوبصورت سا نوجوان کنکھیوں سے مجھے دیکھتا،مسکراتا ہوا نیچے اُترا۔ اُس نے کہا" میرا نام مہدی ہے۔کیفی ابھی تک آئے نہیں ہیں۔ وہ اندھیری کمیون میں رہتے ہیں۔آپ لوگ اوپر آفس میں بیٹھیے۔ ہم اُنھیں فون کر دیں گے، وہ ایک دو گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔" میں بہت تھکی ہوئی تھی۔ میں نے کہا" ہم ہوٹل واپس جاتے ہیں، وہ آئیں تو اُنھیں ہوٹل

بھیج دیجیے گا۔''مہدی نے کہا'' اچھی بات ہے۔''اور ہم چل دیے۔ پاس ہی کہیں کسی ہوٹل سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

'گھونگھٹ کے پَٹ کھول تو ہے پیا ملیں گے'

کوئی سات بجے کے قریب کیفی اور مہدی ہمارے ہوٹل پہنچے۔ ابا جان نے دروازہ کھولا۔ کیفی کو دیکھ کر خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیفی کا بھی عجیب عالم تھا۔اُنھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ میں سچ مچ آجاؤں گی۔

مہدی ہنس کر کہنے لگے''آج تو کیفی موٹر کے نیچے آتے آتے رہ گئے جب اُنھیں پتہ چلا کہ آپ لوگ آئے ہوئے ہیں۔''

مہدی اور کیفی دونوں نے کہا''آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ بنّے بھائی (سجاد ظہیر ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری)اور رضیہ آپا (بنّے بھائی کی بیوی)کو پتہ چل گیا ہے۔ اُنھوں نے آپ کو اپنے گھر بلایا ہے۔کل آپ لوگ ملا بار ہل ،سیکری بھون میں شفٹ ہوجائیں، جہاں اُن کا گھر ہے۔ ہم دونوں آپ کو لینے آئیں گے۔''

کیفی اپنی نیم وا آنکھوں سے صرف مجھے دیکھ رہے تھے، اِس طرح کہ وہ دیکھتے بھی رہیں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے، لیکن میرا رواں رواں اِس بات کو جان رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔

کوئی رات کے بارہ بجے تک یہ لوگ ابا جان سے باتیں کرتے رہے۔ پھر صبح آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ نئے لوگ، نئی دنیا،لیکن ایک ہی سودا سر میں سمایا ہوا کہ میں کیفی سے ہی شادی کروں گی۔

صبح جلدی اُٹھ بیٹھی۔ نہا دھو کر سب سے اچھے کپڑے پہنے۔ آئینے میں دیکھا،

میں اچھی لگ رہی تھی۔ ابا جان بھی نماز پڑھ چکے تھے۔ ہم لوگ ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ کیفی آ گئے۔ اُس وقت کیفی اکیلے ہی آئے تھے۔ ہمارے ساتھ چائے پی، تینوں نیچے اُترے، ٹیکسی لی، سامان رکھا اور مالا بار ہل کی طرف چل پڑے۔ والکیشور روڈ پہنچ کر 7 سیکری بھون، جہاں بنّے بھائی اور رضیہ آپا رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ پہلا کمرہ کافی بڑا تھا اور انتہائی سادگی اور سلیقے سے سجا ہوا۔ دو پیاری سی بچیاں، نجمہ اور مونا بھی تھیں۔ رضیہ آپا اور بنّے بھائی انتہائی خلوص سے ملے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔ رضیہ آپا نے ہنس کر کہا ''اچھا ہوا بھئی تم آ گئیں ورنہ یہ میرا قالین کیفی کے آنسوؤں سے خراب ہو جاتا۔'' ہوتا یہ تھا کہ جب میرے خط آنے بند ہو گئے تو کیفی کا سہارا رضیہ آپا ہی تھیں۔ وہ بڑی بہن کا سا سلوک کرتیں۔ یہ سیدھے قالین پر چت لیٹ جاتے اور آنسو بہاتے رہتے۔ رضیہ آپا پیار سے دِلاسا دیتی رہتیں۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت اِس بات پر ہوئی کہ اِن کے ماحول میں کسی نے اِس بات کا بتنگڑ نہیں بنایا، نہ مذاق اُڑایا، نہ مجھے یہ احساس دلایا کہ میں نے کوئی شرمناک بات کی ہے، نہ کسی نے مجھے حقارت سے دیکھا۔ ہر بات بالکل نارمل تھی۔ میں نے سوچا یہ ماحول اُس ماحول سے کس قدر مختلف ہے جو میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ جہاں کے لوگ چھوٹے، دقیانوسی، پُرانے قدروں کے حامی، انسانی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے کی بجائے اُنھیں اہمیت دے کر تذلیل کرنے والے ہیں۔ اِس پہلے اپریشن نے میرے اِس خیال کو کہ میں صرف کیفی سے شادی کروں گی اور مضبوط کر دیا۔

پھر چائے آ گئی۔ رضیہ آپا نے کہا '' آپ لوگوں کو ہوٹل میں ٹھہرنا ہی نہیں

چاہیے تھا۔ سیدھے ہمارے گھر آجاتے۔''

(حالانکہ اُس وقت میں چائے نہیں پیتی تھی۔ ابا جان کی سخت ممانعت تھی کہ چائے صحت کے لیے بُری چیز ہے)میں نے چپ چاپ چائے کا کپ اُٹھا لیا اور اُسے امرت کی طرح پی گئی۔

شام کو ننّے بھائی نے کہا'' چلیے ،آپ لوگوں کو ہینگنگ گارڈن لے چلیں۔''

اُن کے گھر سے ہینگنگ گارڈن مشکل سے ایک فرلانگ ہو گا۔ میں، ابا جان، کیفی، سردار بھائی، ننّے بھائی، رضیہ آپا، مرزا اشفاق بیگ اور مہدی۔ سب مل کر walk کرتے ہوئے ہینگنگ گارڈن پہنچے۔ پھر ناز ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی منگوائی گئی۔راستے میں ہم لوگوں سے ذرا آگے چلتے ہوئے ننّے بھائی ابا جان سے باتیں کرتے رہے۔ میرے خیال میں وہ ابا جان کو یہی سمجھا رہے تھے''آپ موتی کی شادی کیفی ہی سے کر دیجیے تمام ٹینشن ختم ہو جائے گا۔ اُس لڑکے کو بھی صبر آجائے گا اور آپ کی پریشانیاں بھی دور ہو جائیں گی۔'' ابا جان سر ہلا ہلا کر جی ہاں، جی ہاں کرتے جا رہے تھے۔

ناز ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی۔بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سمندر نے بانہیں پھیلا کر اِس شہر کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہو۔ اور سمندر کے گلے میں کسی نے ہیرے جواہرات کا ہار پہنا دیا ہو اور وہ جگ مگ جگ مگ کر رہا ہو۔ میرے مستقبل کی طرح۔ میں مستقبل کے حسین خوابوں میں کھو گئی۔

کمیون

دوسرے دن ہم کیفی کے ساتھ لوکل ٹرین سے اندھیری کمیون پہنچے۔اندھیری کمیون ایک بہت ہی پُر فضا جگہ پر تھا۔ ایسا لگتا تھا ہم کسی چھوٹے سے hill station پر ہوں۔ بڑے بڑے پیپل کے درخت، کٹھل، کیلے، آم کے درخت۔پیپل کے درخت میں جھولا پڑا ہوا۔ موگرے، جوہی اور رات کی رانی کے پودے اپنی اپنی خوشبوؤں سے ساری فضا کو معطر کیے ہوئے۔ دراصل پہلے اس میں کلچرل اسکواڈ (cultural squad) تھا۔ جس میں تمام آرٹسٹ اور ڈانسر رہتے تھے۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کا ہی ایک ادار ہ تھا۔اس میں سچن شنکر، اودے شنکر کے چچا زاد بھائی، گُل، دینا پاٹھک، پریم دھون اور بھی بہت سارے آرٹسٹ کام کرتے تھے۔بنگال کے قحط کے وقت اِن لوگوں نے سارا ہندوستان گھوم گھوم کر دو لاکھ روپے جمع کر کے بھیجے تھے۔دو لاکھ اُس وقت بہت بڑی رقم تھی۔ یہ لوگ وامق جونپوری کا لکھا ہوا گانا ع

'بھوکا ہے بنگال رے بابا بھوکا ہے بنگال'

گایا کرتے تھے جو بہت مشہور ہوا تھا۔

اندھیری کمیون پہنچ کر میں نے کیفی کا چھوٹا سا کمرہ دیکھا جس میں ایک جھلنگا سا بان کا پلنگ، اُس پر ایک دری، گدا، چادر، تکیہ، ایک طرف چھوٹی سی میز کرسی، اُس پر کتابیں،اخباروں کا ڈھیر، چائے کا مگ اور ایک گلاس۔ مجھے اُس کمرے کی سادگی پر بہت پیار آیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "ٹھہر جاؤ، میں اِس کمرے کو اتنا خوبصورت بنا دوں گی کہ اِس کمرے کی قسمت ہی بدل جائے گی۔"

پھر کھانا کھانے کیمون میں گئے۔ المونیم کی تھالی، دو المونیم کی کٹوریاں، دو دو لکڑی کی چوکیاں۔ ایک پر بیٹھ کر دوسری پر اپنی کھانے کی تھالی رکھ کر کھانا کھایا جاتا تھا۔ پروسنے والا باورچی ہوتا تھا۔ کھانے میں ایک سبزی ایک دال، گھی لگی چار روٹیاں، تھوڑا سا چاول، ایک طرف نمک پیاز، لیموں کا ایک ٹکڑا اور شاید اچار بھی۔

کھانے کے بعد ہر ایک کو اپنے برتن خود دھو کر رکھنے پڑتے تھے۔ ابا جان کو اِن برتنوں میں کھانا کھانا کچھ ناگوار سا لگ رہا تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اِس ماحول کو ناپسند کر کے مجھے واپس چلنے کے لیے نہ کہیں۔ میں ابا جان کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ تھوڑا سا کھانا کھانے کے بعد ابا جان اُٹھ گئے۔ آہستہ سے کہا ''برتن میں نہیں دھوؤں گا۔'' میں نے جلدی سے اُن کے برتن بھی سمیٹ لیے اور انتہائی خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے سارے برتن دھو کر جگہ پر رکھ دیے۔

پھر ہم بنے بھائی کے گھر آ گئے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ابا جان نے مجھ سے کہا '' تیار ہو جاؤ، ہم چوپاٹی تک ٹہل کر آتے ہیں۔'' میں ڈرتے ڈرتے تیار ہوئی اور ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے چوپاٹی کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ابا جان ذرا سنجیدہ سے تھے'' بیٹے، تو یہ ہے اِن لوگوں کی زندگی، اب آپ اپنا فیصلہ سنایئے کہ آیا اب بھی آپ کیفی صاحب سے ہی شادی کرنا چاہتی ہیں یا واپس چلنا چاہتی ہیں۔ ہمارے خاندان میں شادی صرف ایک بار ہوتی ہے۔ لڑکی اپنے شوہر کے گھر سے مر کر نکلتی ہے۔ بعد میں آپ یہ نہ کہیں کہ کیفی صاحب کے پاؤں بڑے ہیں، مجھے پسند نہیں۔ یہ تو ہول ٹائمر ہیں، کچھ کماتے نہیں، یا کسی اور وجہ سے میں طلاق لینا چاہتی ہوں۔''

میں نے چلتے چلتے رک کر ابا جان کی طرف دیکھا ''ابا جان یہ لوگ بہت

اچھے ہیں۔کیفی تو خیر ہول ٹائمر ہیں لیکن اگر یہ ایک مزدور بھی ہوتے تب بھی میں اِن ہی سے شادی کرتی اور ٹوکری سر پر اُٹھا کر مٹی ڈھوتی۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کو شکایت کا موقع کبھی نہیں دوں گی۔''

چنانچہ ہوا بھی ویسا ہی۔ ابا جان مطمئن ہو کر واپس آئے اور بنے بھائی سے کہا ''کل آپ اِن دونوں کا نکاح کر دیجیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں بغیر چھٹی لیے ہوئے آیا ہوں۔''

جب دن مقرر ہو گیا تو میرا دل دھڑکنے لگا کہ کل سے بالکل نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ رات کو نیند بھی نہیں آئی۔ پارٹی میں دھوم مچ گئی۔ کامریڈ گھاٹے جو پارٹی کے خزانچی تھے، قد میں بہت چھوٹے، دبلے پتلے آدمی اور بہت ہی کنجوس، اُنھوں نے سو روپیہ دے کر کہا'' کہیں یہ لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ تو نہیں کہ چار مہینے کے بعد سب ختم، خوامخواہ پارٹی کے سو روپے کا نقصان ہوگا۔'' کامریڈ خوب ہنسے۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ یہ ڈرامہ پچپن سال بعد بھی ختم نہیں ہوگا۔

شادی

دوسرے دن صبح رضیہ آپا قالین پر بیٹھ کر میرے ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھیں کہ میں رونے لگی۔ بنے بھائی اوپر پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ شاید اُنھیں ہلکی سی حرارت بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے'' بھئی یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں، اپنی پسند کی شادی ہو رہی ہے، اِس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے۔ اِس وقت تو ان کو خوب خوش ہونا چاہیے، ہنسنا چاہیے۔''

مجھے اپنا گھر اور اماں یاد آ رہی تھیں۔ مگر رضیہ آپا بالکل ماں کی طرح برتاؤ کر رہی تھیں۔ اپنے بَری کے کپڑے نکال کر لائیں۔ گوٹا لگا غرارہ، زری کا کُرتا، گوٹے لگا دوپٹہ۔ اُنھوں نے اپنی سونے کی دو دو چوڑیاں پہنا دیں اور کیفی کی طرف سے سونے کی ایک چھوٹی سی انگوٹھی۔

شام کو مہدی اور منیش بھنڈی بازار سے قاضی مرگھے کو لیکر آ گئے۔ اُس وقت شاید چار بجے تھے۔ بیچ کا بڑا کمرا مہمانوں سے کھچاکھچ بھر گیا تھا۔ تقریباً تمام ہی ترقی پسند شاعر ادیب جمع ہو گئے تھے مثلاً جوش ملیح آبادی، مجاز، کرشن چندر، مہندر ناتھ، ساحر، پطرس بخاری اور اُن کے چھوٹے بھائی ذوالفقار بخاری (جو ریڈیو اسٹیشن پر اسٹیشن ڈائرکٹر تھے)، وشوا مترا عادل، سکندر علی وجد (جو اورنگ آباد میں جج تھے) عصمت چغتائی، سردار جعفری، سلطانہ آپا، رفعت سروش، میرا جی وغیرہ وغیرہ۔ سکندر علی وجد اور سردار بھائی گواہ بنے اور اندر آ کر مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کو اطہر حسین رضوی ولد فتح حسین رضوی سے نکاح قبول ہے؟'' تب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ کیفی کا اصلی نام کیا ہے۔ جب قاضی نے لڑکے کا مذہب پوچھا تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کیونکہ کیفی شیعہ تھے اور میں سُنّی۔ ایسی شادیوں میں عام طور سے دو قاضی ہوتے ہیں ورنہ کٹھ مُلّا نکاح کو جائز نہیں سمجھتے۔ اب غریب پارٹی مشکل سے تو ایک قاضی لا پائی تھی دوسرا قاضی کہاں سے آتا۔ چنانچہ بنّے بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا ''حنفیہ المذہب'' جوش صاحب نے گھور کر بنّے بھائی کو دیکھا اور کہا ''ہوں؟'' بنّے بھائی نے آنکھ مار کر اِشارہ کیا کہ چُپ رہیے۔ بس نکاح ہو گیا۔ مجھے بہت شرم آ رہی تھی۔ میں اپنا منہ نیچے کیے بیٹھی تھی۔ سلطانہ آپا نے کہا ''موتی، عصمت آئی ہیں۔'' میں نے جلدی سے اوپر دیکھا۔ عصمت آپا کو

بے حد پڑھا تھا۔ اُنھیں دیکھنے کا شوق تھا۔ سب عورتیں کھِکھلا کر ہنس پڑیں اور میں جھینپ گئی۔ سلطانہ آپا میرا ہاتھ پکڑ کر باہر مردانے میں لے آئیں۔ پھر شاعری شروع ہوئی۔ مجاز نے 'آج کی رات' سنائی۔ جوش صاحب نے رباعیاں سنائیں۔ پھر مہدی منیش نے شرارت سے کہا'' جوش صاحب، حیدرآباد کے رواج کے مطابق دولہے کے باپ کے سر پر افشاں مل جاتی ہے۔ اس وقت تو کیفی کے باپ آپ ہی ہیں''۔ معصوم جوش صاحب تیار ہو گئے۔ مہدی، اشفاق بیگ، منیش، سب نے مل کر اُن کے گنجے سر پر خوب افشاں ملی۔ سب لوگ خوب ہنسے۔ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ غرض کہ شام بہت اچھی گزری اور ہماری نئی زندگی کا خوبصورت آغاز ہوا۔

اُس زمانے میں کیفی کی کتاب 'آخرِ شب' چھپ رہی تھی۔ ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ سردار بھائی نے ایک دن میں 'آخرِ شب' کی ایک کاپی، جس کی جلد براؤن چمڑے کی اور انتہائی خوبصورت تھی، چھپوا کر مجھے تحفے میں دی۔ اُس پر اُنھوں نے کیفی کی نظم 'عورت' کا ایک بند خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کھُلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اُس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اُس کتاب کو لے کر خوشی اور تشکر سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ کتاب کیفی نے میرے نام اِس طرح معنون کی تھی۔

'ش' کے نام۔۔۔

''میں تنہا اپنے فن کو آخرِ شب تک لا چکا ہوں تم آ جاؤ تو سحر ہو جائے۔''

کیفی

دوسرے دن جوش صاحب کی محبوبہ نے منہ دِکھائی میں دو روپے دیے جسے میں نے خوشی سے قبول کر لیے۔

جوش صاحب اور بنّے بھائی، ابا جان سے مل کر بے حد خوش تھے۔ بنّے بھائی تو ابا جان کے فین ہو گئے تھے۔ کہنے لگے'' اِس دور میں اتنا ترقی پسند اور reasonable آدمی کم دیکھنے کو ملتا ہے۔''

دوسرے دن میں اور کیفی ابا جان کو چھوڑنے وی .ٹی . اسٹیشن گئے۔ ابا جان نے جاتے ہوئے اتنا کہا'' میں نے تم لوگوں کا تو مسئلہ حل کر دیا لیکن میرا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ابھی مجھے اپنی بیوی کا سامنا کرنا ہے۔''

مجھے ابا جان پر رحم آ گیا۔ میری ماں، باوجود شوہر پرست ہونے کے، بہت جلدی معاف نہیں کرتی تھیں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُنھیں بے حد تکلیف پہنچی اور اُنھوں نے ابا جان سے ایک مہینے تک بات نہیں کی۔

ابا جان کو وی .ٹی . اسٹیشن پر ٹرین میں بٹھا کر ہم سیدھے لوکل ٹرین سے اندھیری پہنچے۔ اندھیری اسٹیشن پہنچ کر ہم نے وکٹوریہ کیا۔ اُس وقت وکٹوریہ کا کرایہ کمیون تک صرف ایک روپیہ ہوتا تھا۔ ہم کمیون پہنچے۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے پیار سے اُس کا بکھرا پن اور غریبی دیکھی۔ سب سے پہلے جھاڑو لے کر آئی۔ جھاڑو دی۔ اُن کی کتابوں کو جھٹک کر صاف کیا، نیچے اخبار بچھائے، اُس پر گدّا اور

رنگین چادر بچھائی، جھلنگا پلنگ باہر نکال دیا۔ ایک چھوٹی سی میزاور کرسی بھی تھی۔ اُنھیں سلیقے سے ایک طرف رکھا۔ میز پر کتابیں رکھیں۔ چائے پینے کے لیے المونیم کا مگ اور ایک گلاس بھی تھا۔ گلاس میں کچھ پھول پتے لگادیئے۔ المونیم کے جگ کو خوب چمکایا۔ کیفی چپ چاپ مجھے کام کرتے دیکھتے رہے۔ اور کہنے لگے ''میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم مجھے مل جاؤ گی۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔''

اُس زمانے میں کیفی پارٹی کے اُردو سہ ماہی پرچے 'نیا ادب' کے اڈیٹر تھے۔ اُنھیں دفتر جانا تھااور وہ چلے گئے۔ اِس دوران میں کمرے کو سجاتی رہی۔ ایک ساڑی کو پھاڑ کر پردہ بنایا اور لسٹ بناتی رہی کہ کمرے کو آرام دہ اور خوبصورت بنانے میں کن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ ابا جان جاتے ہوئے پانچ سو روپے دے گئے تھے۔

میرے ذہن میں جو پہلی چیز آئی وہ یہ تھی کہ ایک چائے کا سیٹ ضروری ہے۔ایک ٹرے اور کیتلی کے لیے ٹی کوزی بھی۔ دوسرے دن میں صبح سویرے سے اُٹھ بیٹھی۔ کیفی دیر تک سوتے تھے۔ باہر جا کر میں نے کمیون کا جائزہ لیا، دیکھا آنگن میں ایک بڑا سا چائے کا پتیلا انگیٹھی پر چڑھا ہوا ہے۔ کامریڈ اپنے اپنے مگ میں چائے لیے اخبار سامنے کھولے پڑھنے میں مصروف ہیں۔ کسی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو ہیلو کامریڈ کہہ کہ پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہوجاتا۔ کامریڈ مرزا اشفاق بیگ کا پاجامہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا لیکن وہ اُس سے بالکل بے نیاز چائے پینے اور اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں نے ایک مگ اور مانگا اور دومگوں میں چائے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔بہت پیار سے کیفی کو اُٹھایا اور ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ روز چائے کے بعد سب کامریڈ جلدی جلدی نہا دھوکر تیار ہوکر کھانے کے

کمرے میں چلے جاتے۔کھانا کھا کر اپنے اپنے فرنٹ پر چل پڑتے اور شام کو ہی لوٹتے۔

کیمون کی دنیا میرے لیے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پیپل اور کٹھل کے بڑے بڑے پیڑوں سے گھری ہوئی یہ جگہ بہت ہی خوبصورت تھی اور اس سے بھی خوبصورت تھے وہاں کے لوگ۔ روشن دماغ، انسان دوست، کچلے ہوئے پریشان حال بھوکے انسانوں کے لیے ایک نئی دنیا بنانے کی دھن میں جدوجہد کرتے لوگ، ہندستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ لیکن لگتا تھا کہ سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ سبھی کامریڈ، کامریڈ پکارے جاتے تھے۔ اُس وقت کامریڈ کا مطلب تھا 'مکمل آدمی'۔

اُس زمانے میں بنّے بھائی کے گھر میں ہر اتوار کو ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ ہوا کرتی تھی۔شعرا اور ادیب اپنی نظمیں اور کہانیاں سناتے تھے اور اُس پر زوردار تنقید اور بحث ہوتی تھی۔ میٹنگ چار بجے سے رات آٹھ بجے تک چلتی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ غیر حاضر رہتا۔ بنّے بھائی کی نگاہ ہر ایک پر ہوتی اور خاص طور سے کیفی اور مجھ پر۔شام کو رضیہ آپا کی مہربانی سے سب کو چائے کا ایک پیالہ مل جاتا۔

اکثر میں اور کیفی بنّے بھائی کے گھر سے پیدل ہی چوپاٹی کی طرف نکل جاتے تھے۔بھٹّے کھاتے ہوئے، ہنستے مسکراتے، زندگی کی اونچ نیچ سے بے خبر۔ ایک دوسرے کے پیار میں سرشار، روشن مستقبل کی تصویر آنکھوں میں لیے۔

ایک اتوار کو میرا جی چاہا کہ پکچر دیکھیں۔ میں نے کیفی سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ کیفی فوراً تیار ہو گئے۔ اُس وقت اُن کی جیب میں صرف ڈھائی روپے تھے۔7 سیکری بھون سے چرنی روڈ کوئی ایک میل کے فاصلے پر ہے۔اُس زمانے

میں وہاں راکسی سنیما ہال تھا، جس میں چیتن آنند کی فلم 'سفر' چل رہی تھی۔ ہم لوگ تین بجے کے شو کے لیے پیدل ہی چل پڑے۔سوا سوا روپے کے دو ٹکٹ لے کر پکچر دیکھی۔انٹرول میں مجھے پیاس لگنے لگی میں نے کیفی سے کہا۔ اُس زمانے میں تمام نل دوپہر میں بند رہا کرتے تھے۔راکسی کے نکڑ پر ایک بُڑھیا مٹکے میں پانی لیے بیٹھی، دو پیسے میں ایک گلاس پانی بیچا کرتی تھی۔ ہمارے ڈھائی روپے تو ٹکٹ کی نذر ہو چکے تھے۔ کیفی نے کہا ''جاؤ، اُس بڑھیا سے پانی لو اور پی لو۔ پیسوں کے لیے کہہ دینا کہ میرے شوہر وہاں ہیں میں ابھی اُن سے پیسے لے کر آتی ہوں اور بھاگ آنا۔'' میں نے ویسا ہی کیا اور بھاگ آئی۔بعد میں جب کبھی اوپیرا ہاؤس سے ہم دونوں کا گزر ہوتا تو کیفی کہتے ''وہ بڑھیا اپنے دو پیسے کے خاطر تمھارا انتظار کر رہی ہے۔'' میں ہنس پڑتی۔ اُس دن ہم میٹنگ میں بھی نہیں گئے جس کی دوسرے دن بنّے بھائی نے خبر لی ''بھئی تم دونوں کل میٹنگ میں نہیں آئے بہت بُرا کیا۔ آئندہ اِس کا خیال رکھا کرو۔'' کیفی کچھ اُلٹے سیدھے بہانے بنانے لگے اور میں اپنے دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر ہنسی کو چھپاتی رہی اور وہاں سے چلی گئی۔

1947 میں جو مشاعرے ہوا کرتے تھے اُن میں ترقی پسند اور روایتی، دونوں ہی شعرا شریک ہوتے تھے۔ ترقی پسند شعرا میں جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری ہوتے۔ یہ شعرا اپنے نئے موضوعات، اپنی آواز اور پڑھنے کے انداز کی وجہ سے مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ مکرر ارشاد مکرر ارشاد کے نعروں سے ہال گونج اُٹھتا جب کہ روایتی شاعروں کو ایسی داد نہیں ملتی تھی۔مشاعرے کے اگلے دن سب بنّے بھائی کے گھر پر جمع ہوتے اور اُن سے خوب شاباشی پاتے تھے۔بنّے بھائی اپنے مخصوص انداز میں کہا کرتے تھے: ''بھئی

واہ، کل کا مشاعرہ تو ہمارے پٹھوں نے جیت لیا۔'' کیفی کی نظمیں 'عورت'، 'حقیقتیں'، 'تاج' وغیرہ بے حد مقبول تھیں۔ ساحر کی نظم 'تاج محل' سنے بغیر ساحر کو چھوڑا نہیں جاتا تھا۔ اُس وقت لوگ اُردو آج سے زیادہ سمجھتے تھے اور روایتی عشقیہ شاعری سے مختلف اور متنوع، ترقی پسند شاعری کو کھل کر داد دیتے تھے۔

ایک بار کا واقعہ ہے میری نئی نئی شادی ہوئی تھی، کیفی ایک مشاعرے میں شاید مجھ کو مرعوب کرنے کے لیے آڈینس پر چھا جانے والے انداز اور بے حد موڈ میں نظم 'حقیقتیں' سنا رہے تھے۔ جب وہ اس بند پر پہنچے

وہ رفیقہ وہ مری مونسِ اخلاص پناہ
جس کی مدقوق جوانی ہے مصائب کی گواہ
دامنِ قصدِ تبسم میں سمیٹے ہوئے آہ
دیر سے ہوگی مرے واسطے جو چشم براہ
نذر کو اُس کی ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں

پھر تو لوگ مڑ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ شاید سوچتے ہوں گے کہ یہ تو اچھی بھلی چنگی خوبصورت کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی ہے تو پھر کیفی کی وہ مدقوق جوانی اور مصائب کی گواہ بیگم کہاں ہیں۔ مجھے بڑی شرم آرہی تھی۔

بنے بھائی نے دوسرے دن مجھ سے کہا ''کہ بھئی موتی، تمھارے شوہر نے تو کل مشاعرہ لوٹ لیا۔''

آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ دنیا حیدر آباد کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ اِن لوگوں کا رشتہ چند انسانوں سے ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت سے بندھا ہوا ہے۔ یہ اپنے گھر، اپنی بیوی بچوں کا اتنا نہیں سوچتے جتنا مزدور، کسان،

اور محنت کش انسانوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اِن کا مقصد اُنھیں اِس استحصال کرنے والے سرمایہ دارانہ نظام کے پنجۂ غضب سے چھڑانا ہے۔

کیفی نے مجھے شادی کے بعد جو پہلا تحفہ دیا وہ ایک کتاب تھی جس کا نام تھا 'انسان کا عروج' جس میں انسان کے ارتقا کی تاریخ تھی۔ کتاب دلچسپ تھی۔ میں نے پڑھ ڈالی اور محسوس کیا کہ جو جالے حیدر آباد کے جاگیر دارانہ متوسط طبقے کی وجہ سے میرے ذہن سے چمٹے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ ہٹ رہے ہیں۔ ہر ترقی پسند خیال کو میرا ذہن فوراً قبول کرنے لگا تھا۔

مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ بے لوث لوگ اِس قدر کام کرتے ہیں۔اِن کا کھانا کچھ بہتر ہونا چاہیے۔ مجھے اِس میں دلچسپی لینا چاہیے تاکہ اِن لوگوں کی صحت زیادہ اچھی رہے۔ چنانچہ میں نے سلطانہ آپا سے صلاح لی۔ وہ فوراً راضی ہوگئیں۔ طے پایا کہ آج جب کامریڈ لوٹیں گے تو ہم ایک نیا مینو پیش کریں گے۔ میں نے کہا ''میں آلو کا بھُرتا بنانا بہت اچھا جانتی ہوں۔'' سلطانہ آپا نے کہا '' میں گُڑ کے میٹھے چاول بناؤں گی۔'' چنانچہ ہم لوگ باورچی خانے میں گئے اور باورچی سے اپنی بات کہی۔ وہ نرم مزاج پہاڑی آدمی تھا، اُس نے کہا ''ضرور پکائیے۔''

میں نے اُسے بہت سارے آلو اُبالنے کو کہا اور اُس میں ہری مرچ کاٹ کر، ہرا دھنیہ نمک وغیرہ ملا کر، ہاتھ سے آلوؤں کو مسلا۔بس پھر کیا تھا، ہاتھ میں جیسے پتنگے لگ گئے۔ پورا ہاتھ جلن کے مارے لال ہو گیا۔ بیچارے کیفی کبھی تیل لگائیں کبھی پنکھا جھلیں اور ساتھ ہی مسکراتے بھی جائیں۔ دوسری طرف سلطانہ آپا میرے کمرے میں گھبرائی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں ''موتی غضب ہو گیا، کامریڈوں کے آنے کا وقت قریب آگیا ہے اور یہ کم بخت چاول تو گلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔''

میں اُسی حالت میں دوبارہ باورچی خانے میں گئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ گڑ کے شیرے میں چاول کا گلنا مشکل ہے۔ میں نے رائے دی ''ایسا کرتے ہیں کہ چاول چھلنی سے دوسرے پتیلے میں چھان کر نکال لیتے ہیں۔ اُنھیں پانی میں الگ پکا کر پھر گڑ کا شیرا ڈالیں گے۔ تب میٹھے چاول مزیدار پک جائیں گے۔ اوپر سے تھوڑا سا کیوڑے کا عرق اور ناریل کس کر ڈال دیں گے۔'' باورچی سے مدد لے کر ایسا ہی کیا۔

سارے کامریڈ کھانے میں یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر تو میں نے ایک دن عصمت آپا سے پوچھ کر کوفتے بنائے۔ پھر کیا تھا کامریڈ خوشی سے اُچھلنے لگے اور نعرے بلند ہوئے ''کامریڈ موتی زندہ باد، کامریڈ موتی کی جےٗ ہو۔''

پھر دن گزرتے گئے اور ہندستان کی آزادی کا حسین دن پندرہ اگست آ پہنچا۔ کمیون میں صبح سویرے سے ہی ہلچل مچ گئی۔ تمام کامریڈ نہا دھو کر جو بھی اچھے کپڑے تھے، پہن کر تیار ہو گئے اور سویرے آٹھ بجے ہی کمیونسٹ پارٹی کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ترنگا لہرایا گیا۔ چاروں طرف سے نعروں کا شور بلند ہو رہا تھا، ''انقلاب زندہ باد، ہندستان کی آزادی زندہ باد، بھارت ماتا کی جےٗ، سلطنتِ برطانیہ مردہ باد۔''

سب سے پہلے مجاز نے اپنا گیت سنایا 'بول اری او دھرتی بول' سردار جعفری نے ایک انقلابی نظم پڑھی۔ کیفی نے نظم سنائی۔ پھر پارٹی کی خوبصورت نوجوان لڑکیوں نے جن میں دینا اور ترلا بھی تھیں 'سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا' گایا۔ پی. سی. جوشی، اور سجاد ظہیر نے تقریریں بھی کیں۔ پھر سب لوگ جلوس کی شکل میں جمع ہونے لگے اور میں ایک دھان پان سی دبلی پتلی لڑکی آنکھوں میں آزاد

ہندستان کے واسطے حسین خواب لیے، کیفی کا ہاتھ پکڑے پکڑے اُس جلوس کے ساتھ چل پڑی۔ جلوس گوالیا ٹینک جا کر رُکا۔ پھر تقریریں، ناچ گانا، نعرے خوب ہنگامے ہوئے۔ پھر جلوس ختم ہوا۔ میں تو اپنے کمرے میں آکر سو گئی۔ بہت تھک گئی تھی لیکن سردار بھائی۔، ظ انصاری، مرزا اشفاق بیگ، مہدی، منیش سب شہر میں گھومتے رہے۔ایک ایرانی ہوٹل میں گئے جہاں جارج پنجم کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ سردار بھائی میز پر چڑھ گئے اور جارج پنجم کی تصویر نکال کر زمین پر پٹک دی۔ بیچارہ مالک منع کرتا ہی رہ گیا لیکن اِن لوگوں کے تیور سے ڈر بھی گیا تھا۔ اس پر ظ انصاری بگڑ گئے کہ سردار کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور کچھ بُرا بھلا بھی کہا۔ سردار بھائی کو غصہ آ گیا۔اُنھوں نے ظ انصاری کو اتنا کس کر طمانچہ رسید کیا کہ اُن کا سر گھوم گیا۔ وہ ڈر کر چپ ہو گئے۔اُس وقت تمام کمیونسٹ اِسی موڈ میں تھے کہ انگریزوں کی ایک ایک نشانی مٹا دیں گے۔

پھر قیامت خیز فسادات کی خبریں آنے لگیں،جنھیں سن کر میرا دل دہل جاتا تھا۔پی.سی. جوشی نے تمام کامریڈوں کو آرڈر دیا تھا کہ کوئی شیروانی پہن کر باہر نہ جائے،صرف شرٹ اور پینٹ پہنے۔

اِسی طرح سے پارٹی کوشش کر رہی تھی کہ لوگ اس فرقہ وارانہ جنون کو چھوڑ دیں۔ انڈین پیپلز تھیٹر (اپٹا، جو کمیونسٹ پارٹی کا ہی آرگنائزیشن تھا) میں بھی فسادات کے خلاف ڈرامے شروع ہو گئے تھے۔ میں اِن سب باتوں سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں کھوئی رہتی۔ مجھے یہ احساس بہت رہتا تھا کہ صبح کی چائے ذرا اچھی طرح سے پینا چاہیے۔چنانچہ ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی، ایک ٹی کوزی کاڑھ رہی تھی (کیونکہ چائے ٹی سیٹ میں پینے کی خواہش کو میں ابھی تک

روک نہیں سکی تھی) کہ پی. سی. جوشی میرے کمرے میں آئے۔ خاکی رنگ کا نیکر اور سفید رنگ کی آدھی آستینوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ ابھی تک میں نے اُنھیں اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ رنگ کھلتا ہوا سانولا، نمکین، نیک چہرہ، لگتا تھا کہ محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھ گئی۔ پوچھا ''تمام دن کیا کرتی رہتی ہو؟'' میں نے شرما کر کہا '' کچھ نہیں۔'' وہ مسکرائے اور بہت ہی نرم لہجے میں کہا '' کمیونسٹ شوہر کی بیوی کبھی بیکار نہیں رہتی۔ اُس کو اپنے شوہر کے ساتھ پارٹی کا کام کرنا چاہیے۔ پیسے کمانے چاہئیں اور بعد میں بچے ہوں تو اُنھیں اچھا شہری بنانا چاہیے۔ تب ہی وہ مکمل کمیونسٹ کی بیوی بن سکتی ہے۔'' وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن میرے کچے دماغ میں اِن باتوں نے ایک ہلچل سی مچا دی بلکہ یہ باتیں میرے دل میں پتھر کی لکیر بن گئیں۔ اُن کے لہجے کی سادگی اور خلوص میں اتنی طاقت تھی کہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اُنھوں نے جو کہا ہے وہ کر دکھاؤں گی۔ کیفی کے آتے ہی میں نے سارا واقعہ سنایا اور کہا ''میں پیسے کمانے کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی کام کروں گی۔'' دراصل میں پارٹی ممبر نہیں تھی اِس لیے پارٹی میرے کھانے کے 30 روپے نہیں دیتی تھی۔ کیفی کو کمانے پڑتے تھے۔ چونکہ کیفی ہول ٹائمر تھے اِس لیے پیسے کمانے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے۔ اُنھوں نے اُردو کے ایک ڈیلی پیپر 'جمہوریت' میں پانچ روپیہ روز پر ایک طنزیہ مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی۔ روز اُنھیں کوئی نہ کوئی نیا موضوع سوچنا پڑتا تھا۔ وہ بیچارے روز صبح پانچ بجے اُٹھ کر، کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتے اور لکھنے لگتے۔ اُنھیں اِس طرح لکھتے دیکھ کر میرا دل کٹ سا جاتا لیکن میں اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

پی.سی. جوشی سے ملنے کے بعد میں نے طے کرلیا کہ میں بھی کچھ نہ کچھ پیسے کماؤں گی ضرور۔کیفی ہنسنے لگے کہ میں کیا کر سکتی ہوں، صرف میٹرک تک پڑھا ہے۔نوکری کہاں سے ملے گی۔ میں نے کہا''میں اسکول کے سالانہ جلسوں کے ڈراموں میں کام کیا کرتی تھی۔ریڈیو کے ڈراموں میں حصہ لے سکتی ہوں۔ میری آواز اچھی ہے اگر فلمی گانوں کے کورس میں جگہ مل جائے تو میں بھی پیسے کما سکتی ہوں۔'' کیفی نے کہا ''ٹھیک ہے۔کل میں تمھیں ریڈیو اسٹیشن لے جاؤں گا وہاں دوبے میرے دوست ہیں۔(دوبے جو بعد میں ایچ .ایم. وی کے جنرل منیجر بنے اُس وقت ریڈیو کے ڈرامے ڈائریکٹ کرتے تھے۔) میرا آڈیشن کامیاب ہوا اور جب پہلی بار ریڈیو کے ایک ڈرامے میں کام کرنے کے بعد مجھے دس روپے ملے تو جیسے میری چاندی ہوگئی۔ وہ دس روپے پا کر مجھے جتنی خوش ہوئی تھی اُس کا بیان مشکل ہے۔

اُس زمانے میں پریم دھون جو پارٹی میں کام کرتے تھے۔فلموں میں گانے بھی لکھتے تھے۔میں نے اُن سے کہا ''کورس میں مجھے کام دلوایئے۔'' وہ سن کر بولے''آپ کام کریں گی؟''میں نے کہا ''کیوں نہیں؟ میری آواز اچھی ہے،کورس میں تو گا ہی سکتی ہوں۔''اُنھوں نے کہا ''اچھا، کل دس بجے برمن دا (ایس .ڈی. برمن) میرے گانے کی ریہرسل کروا رہے ہیں۔ میں تمھیں اُن سے ملوادوں گا۔''

اگلے دن میں اُن کے ساتھ گئی۔ اُس وقت اُن کی ہونے والی بیوی 'نور' بھی ساتھ تھی، جس کی آواز اچھی تھی اور وہ بھی کورس میں گانے والی تھی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ کون سا تھیئٹر تھا، شاید دادر میں ہوگا، جہاں ایک خوبصورت لڑکا بیٹھا گانے کی ریہرسل کر رہا تھابعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ خوبصورت لڑکا مکیش تھا۔

برمن دا نے میری آواز پاس کردی۔ دو دن مجھے ریہرسل کرنی پڑی۔ ریکارڈنگ پر مجھے تیس روپے ملے۔ کچھ نہ پوچھیے کہ اُن تیس روپوں کی میرے نزدیک کیا قدر تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے اپنی محنت سے تیس روپے کمائے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ جب لوگوں کو پتہ چلنے لگا کہ میں کام کرسکتی ہوں تو مجھے ڈبنگ وغیرہ کا کام بھی ملنے لگا جس کے کبھی دو سو کبھی پانچ سو روپے بھی مل جاتے۔

اِپٹا کی بنیاد ڈالنے والوں میں سردار جعفری، انل ڈسلوا، خواجہ احمد عباس وغیرہ تھے۔ یہ بات اگست 1947 کی ہے۔ اُس وقت اِپٹا میں بڑے بڑے لوگ کام کرتے تھے۔ مثلاً بلراج ساہنی، اُن کے بھائی بھیشم ساہنی، پریم دھون، دینا پاٹھک، عباس صاحب کی بیوی مُجی، موہن سہگل، وشومترا عادل وغیرہ۔ باوجود یہ کہ اُس وقت تک پرتھوی تھیٹر قائم ہو چکا تھا، پرتھوی راج کپور اِپٹا کے اعزازی پریزیڈنٹ تھے۔ پرتھوی تھیٹر کے خاص آرٹسٹ مثلاً عذرا بٹ، زہرا سہگل بھی اِپٹا میں اعزازی ممبر تھے۔

ایک دن خواجہ احمد عباس کی بیوی مُجی، جو بہت ہی نمکین شکل کی تھیں میرے کمرے میں آئیں اور باتوں باتوں میں اُنھوں نے پوچھا ''تم اِپٹا میں کام کروگی؟'' میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے پوچھا ''کون سا کام؟'' اُنھوں نے کہا ''آج کل ہندو مسلم فسادات بہت ہو رہے ہیں۔ اُسی کے بارے میں عصمت آپا نے ایک ون ایکٹ ڈرامہ لکھا ہے 'دھانی بانکیں'۔ اُس میں ایک نئی نویلی بہو کا کردار ہے۔ یہ ڈرامہ بھیشم ساہنی ڈائرکٹ کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ رول تم کرو۔'' میں خوشی سے اُچھل پڑی۔ میں تو دل سے چاہتی تھی کہ پارٹی کی

کسی تنظیم میں کام کروں۔ اِس لیے فوراً ہاں کر دی۔ کیفی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

دوسرے ہی دن میں کیفی کے ساتھ شام کو چھ بجے اِپٹا کے دفتر پہنچی۔ اُس زمانے میں اِپٹا کی ریہرسل ایک چھوٹے سے تھیٹر دیودھر ہال میں ہوا کرتی تھی جو چوپاٹی سے اوپیرا ہاؤس جاتے بائیں طرف پڑتی ایک گلی میں تھا۔ چھ بجے سب لوگ وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی اور مجھ سے بہت پیار سے ملے۔ اُس زمانے میں پارٹی میں ایسا ماحول تھا جیسے ایک خاندان کے محبت کرنے والے لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے ہوں۔ کوئی جلن، حسد یا نفرت جیسے جذبات اُن کے دلوں میں جنم ہی نہیں لیتے تھے مثلاً اِپٹا میں نور بھی تھی جو تقریباً میری ہی عمر کی ہوگی۔ اُسے بھی میری جگہ 'دھانی بانکیں' میں لیا جا سکتا تھا۔ اِس کے باوجود وہ مجھ سے بہت خلوص سے ملی۔

ڈرامے کی ریڈنگ شروع ہوئی۔ بھیشم ساہنی مجھ سے بہت خوش تھے۔ ڈرامے میں ایک چوڑی والی کا رول زہرہ سہگل کر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ زہرا آپا اپنا سفید برقع زمین پر ڈال کر پیروں سے میلا کر رہی ہیں۔ میں حیران پریشان یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر ہمت کر کے پوچھا'' آپ اپنا برقع میلا کیوں کر رہی ہیں؟'' وہ ہنس کر بولیں ''بھلا چوڑی والی کیا سفید برقع پہنے گی؟ اُس کا برقع تو میلا ہی ہونا چاہیے نا۔ میں اپنے کیریکٹر میں آنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' جب ریہرسل شروع ہوئی تو چوڑی والی کو میری ساس نے پان کا بیڑا پیش کیا۔ پان کھاتے کھاتے چوڑی والی جو قہقہہ مار کر ہنسی تو میں بوکھلا گئی۔ بالکل چوڑی والیوں جیسی ہنسی تھی۔ میں زہرہ آپا کی ایکٹنگ کی قائل ہوگئی۔ میری ساس کا رول عذرا بٹ کر رہی تھیں اور ہندو ماں کا رول دینا پاٹھک نے کیا تھا۔

سندر بائی ہال میں ڈرامہ ہوا۔ بہت کامیاب رہا۔ کچھ کامریڈوں کا کہنا تھا کہ میں نے اچھا کام کیا لیکن میری آواز آخر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اِس کے باوجود بھی میرے ڈائرکٹر بھیشم ساہنی مجھ سے بہت خوش تھے۔

بھیشم ساہنی نے فوراً ایک دوسرا ڈرامہ 'بھوت گاڑی'، جو ایک انگلش ڈرامے کا اڈاپٹیشن (adaptation) تھا، شروع کیا اور مجھے مرکزی رول آفر کیا۔ یہ ایک ایسی بھولی بھالی لڑکی کا رول تھا جو بظاہر بڑی معصوم ہے لیکن اندر سے انگریزوں کی ایجنٹ اور بڑی مکّار۔ وہ ہندوؤں کو الگ اسلحہ سپلائی کرتی ہے اور مسلمانوں کو الگ ہتھیار دیتی ہے۔ بلراج ساہنی ایک سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر کا رول کر رہے تھے جو بعد میں اس مکّار لڑکی کو گرفتار کر لیتا ہے۔ اِس مکّار لڑکی کا کیرکٹر کرنا آسان نہیں تھا۔ میں ذرا ڈر سی گئی مگر کیفی مجھ سے زیادہ ڈر گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید میں یہ رول نہیں کر پاؤں گی لیکن میں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ بہت محنت سے وہ رول کیا۔ اُس زمانے میں احمد آباد میں اپٹا کی کانفرنس تھی۔ بارہ ہزار لوگوں کے سامنے وہ ڈرامہ پیش کیا گیا اور بے حد کامیاب ہوا۔ تقریباً تیس برس بعد جب میں شبانہ کے ساتھ احمد آباد گئی تو لوگوں کو میرا وہ رول تب بھی یاد تھا۔

○

لکھنؤ اور مجواں

1948 میں جب میرا پہلا بچہ ہونے والا تھا تو کیفی مجھے لکھنؤ اپنے گھر لے گئے۔ وہاں اُن کے بڑے بھائی اچھن بھیا اور بڑی بہن، واجدہ باجی، رہتے تھے۔ باوجود اِس کے کہ میں برقع نہیں پہنتی تھی اور سنی مسلک سے تھی جب کہ کیفی کے خاندان والے پرانے خیالات کے اور خالص شیعہ تھے، مجھ سے بہت پیار سے ملے۔ میں واجدہ باجی کے ہاں ٹھہری کیونکہ کیفی واجدہ باجی کے بہت چہیتے بھائی تھے۔ یہ وہی واجدہ باجی تھیں جو بچپن میں کیفی کو میر انیسؔ پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ اُنھیں ہومیوپیتھی کا خاصا علم تھا۔ اکثر لوگوں کو دوائیں بھی دیتی تھیں۔ مجھ سے بہت پیار سے ملیں۔ اچھن بھیا اوراُن کی بیوی، دلہن بھابھی بھی بڑی محبت سے پیش آئے۔

لکھنؤ میں پہلی بار گئی تھی اور یہ شہر میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زبان اور لہجہ بہت خوبصورت تھا۔ لکھنو میں دو طرح کے لکھنؤ تھے۔ ایک پرانا لکھنؤ اور ایک نیا لکھنؤ۔ واجدہ باجی کا گھر پرانے لکھنؤ میں تھا۔ وہاں کا ماحول بھی دلچسپ تھا۔ اچھن بھیا ڈالی گنج میں رہتے تھے۔ وہ وکیل تھے۔ میرا سارا خرچ وہ ہی اُٹھاتے تھے۔ مُنیش نارائن سکسینہ بھی لکھنو کے تھے اور اُن دنوں وہیں آئے

ہوئے تھے۔ اکثر وہ سائیکل پر باجی کے گھر آجاتے۔ کیفی تانگہ کرائے پر لاتے۔ تانگے میں دونوں طرف چادر کے پردے لگائے جاتے۔ میں اور کیفی تانگے میں بیٹھ جاتے۔ مُنیش ہمارے ساتھ سائیکل پر حضرت گنج جاتے۔ کافی ہاؤس میں اُتر کر تینوں کافی پیتے اور دلچسپ باتیں کرتے۔ واپسی میں تانگے میں لگے پردے وہیں لاؤنڈری میں دے دیے جاتے۔

جب باجی کو پتہ چلا تو صرف اتنا کہا: ''دلہن ہمارے یہاں بے پردگی کو عیب سمجھا جاتا ہے۔'' میں چپ ہوگئی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر کیفی کی والدہ اور والد جو اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں زمین دار تھے، مجھے دیکھنے لکھنو آگئے۔ کیفی کے سارے خاندان نے مجھے بہت پیار سے قبول کیا کسی نے اِشارتاً بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس میں کسی تلخی یا تنقید کا پہلو ہو۔

کیفی کے خاندان والے سیدھے سادے محبت کرنے والے لیکن پرانے خیال کے لوگ تھے۔ لڑکیوں کو اسکول کالج بھیجنے کے خلاف، پردے کے سخت حامی۔ ابا ہمیشہ گھر میں کھنکار کر داخل ہوتے تاکہ اگر کوئی لیٹا ہے تو اُٹھ کر بیٹھ جائے۔ میاں بیوی ایک پلنگ پر بیٹھے ہوں تو الگ ہو کر بیٹھیں وغیرہ وغیرہ۔ میرا پہلا بیٹا لکھنؤ کے اسپتال میں 26 اپریل 1948 کو پیدا ہوا۔ واجدہ باجی اور میری ساس ساتھ ہی تھیں۔اُس کے پیدا ہونے پر پاس کے کمروں سے عورتیں پوچھنے آئیں، ''چچی اطہر کے ہاں لڑکا ہوا کہ لڑکی؟'' اماں (میری ساس) نے منہ بنا کر کہا ''بیٹی ہوئی ہے''۔ میں چونک گئی۔ عورتوں کے جانے کے بعد میں نے اپنی ساس سے پوچھا ''اماں، مجھے تو لڑکا ہوا ہے'' اماں منہ پر اُنگلی رکھ کر آہستہ سے بولیں، ''چپ چپ، زور سے

نہ بول،نظر لگ جائے گی۔یہاں کی عورتیں بہت جلد نظر لگا دیتی ہیں۔'' میں حیران رہ گئی کہ یہاں لڑکے کی اتنی اہمیت ہے۔ اور آج سوچتی ہوں تو اُس وقت کی حیرت دکھ میں بدل جاتی ہے۔آج تو لڑکیوں کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا۔ پیٹ میں ہی نکلوادیا جاتا ہے اور کچھ شہر تو لڑکیوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔ شادی کے لیے لڑکوں کو لڑکیاں نہیں مل رہی ہیں۔ایک طرف تو سائنس ترقی کر رہی ہے، انسان کی عمر کا اوسط بڑھ رہا ہے اور دوسری طرف اتنی جہالت۔ افسوس صد افسوس۔ چار مہینے بعد اماں اور ابا نے مجھے گاؤں، مجواں آنے کی دعوت دی۔ میں اپنے چار مہینے کے بچے کو لے کر کیفی کے ساتھ مجواں گئی

مجواں میں کیفی کا گھر تو کافی بڑا تھا لیکن گاؤں بہت ہی چھوٹا سا تھا۔ شاہ گنج اسٹیشن سے اُتر کر ہمیں چھوٹی لائن سے پھول پور اُترنا پڑتا اور پھر وہاں سے دو کلومیٹر ڈولی میں بیٹھ کر جانا پڑتا تھا۔ مجواں تک کوئی سڑک نہیں تھی کھیت ہی کھیت تھے۔ گاؤں اتنا چھوٹا تھا کہ اُس میں کوئی دوکان نہیں تھی،بجلی نہیں تھی،نل نہیں تھا۔ پانی کنویں سے بھرا جاتا تھا۔ پانی بھرنے کے لیے ابا نے اپنی زمین پر ایک دُھنیہ خاندان کو بسا لیا تھا (دُھنیے وہ لوگ جن کا آبائی پیشہ رضائی لحاف گدوں کے لیے روئی دُھنا ہوتا ہے۔)۔ اُس دُھنیے کی بیوی رحمتیہ، جو بڑے ٹھسے سے رہتی تھی،چاندی کے زیوروں سے لدی،ہمارا پانی بھرتی تھی۔ہماری ایک نوکرانی کا نام ٹلیا تھا جو کھانا پکاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں ٹھٹ کی ٹھٹ مجھے دیکھنے کے لیے جمع ہوتی تھیں۔ اُن کے سامنے مجھے شرما کر جھک کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ سب کو میری شکل بہت پسند آئی لیکن باہر جاتے جاتے ایک خاتون نے کہہ ہی دیا۔''چچی کی ہڈی میں تو پیوند لگ گیا۔'' (کیونکہ میں شیعہ نہیں تھی)۔

ہم لوگ اندر کے کمرے میں رہتے تھے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اندر فرشی پنکھا لگا ہوا تھا۔ ایک میز، ایک کرسی، دو پلنگ۔ ایک پلنگ پر میں اور میرا بچہ دوپہر میں سو جاتے تھے۔ کیفی میز پر جھکے ہوئے نظمیں لکھنے میں مصروف رہتے۔ اُنھوں نے اپنی نظمیں 'ٹیلیفون'، 'تلنگانہ' وغیرہ وہیں لکھیں۔ پیر میں پنکھے کی ڈوری باندھ کر اُسے کھینچتے رہتے۔ گاؤں میں بھلا اپنی بیوی کے لیے کوئی کاہے کو کام کرتا ہوگا! باہر لڑکے کیفی کا خوب مذاق اُڑاتے۔ اُن کے دوست ڈوری کھینچنے کی نقل کر کے اُنھیں ستاتے رہتے۔

ایک دن کیفی کی والدہ شکایت کرنے لگیں ''اطہروا، (اطہر حسین رضوی، کیفی کا گھریلو نام) تم وہی ہو نا کہ جب کوئی مہمان گھر آنے کے بعد واپس جانے لگتا تھا تو تم چھپ کر ایک کونے میں کھڑے ہو کر اتنا روتے تھے کہ تمھارا دامن آنسوؤں سے بھیگ جاتا تھا اور اب بمبئی جا کر تم ہم کو کئی کئی مہینے تک خط نہیں لکھتے۔

مجواں میں ہمیں چار مہینے ہو گئے تھے۔ اِتنے دنوں تک گھر میں بند رہنا شاید میرے لیے دوبھر ہو جاتا مگر کیفی کی والدہ اور واجدہ باجی مجھے کیفی کے بچپن کے قصے سناتی رہتی تھیں۔ جو میرے لیے بہت دلچسپ تھے۔

شیعہ گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے میر انیسؔ کے مرثیے واجدہ باجی چھ سال کے اطہر کو اپنے پاس لٹا کر سنایا کرتی تھیں۔ واجدہ باجی نے بتایا کہ نو روز منایا جا رہا تھا اور چھوٹے سے اطہر نے اپنی توتلی زبان میں یہ شعر پڑھا:

صبا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی
بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار آئی

اُس وقت اطہر کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔

ایک روز واجدہ باجی ہنس کر ایک قصہ سنانے لگیں :

''ایک دن شام کے چار بجے ابا اوراُن کے دوست بابو خاں بیٹھک (ڈرائینگ روم) میں باتیں کر رہے تھے۔ اطہر باہر لڑکوں کے ساتھ کھیل کر اندرون خانہ جاتے ہوئے بیٹھک سے گزرے تو بابو خاں کو نظر انداز کر کے، سلام کیے بغیر ہی نکل گئے۔ یہ بات ابا کو بری لگی۔ جب بابو خاں اُٹھ کر چلے گئے تو ابا نے اطہر کو بلایا اور پوچھا،

ابا : اطہر، بابو خاں بیٹھے ہوئے تھے، تم نے اُن کو سلام نہیں کیا؟

اطہر : (سر کھجاتے ہوئے) ابا۔۔ میں نے۔۔ اُن کو دیکھا نہیں تھا۔

ابا : کوئی بات نہیں۔۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ اچھا، اب ایسا کرو کہ جو سامنے تاڑ کے درخت ہیں، جاؤ، باری باری سب کو سلام کرو۔

(اطہر کا دم نکل گیا کیونکہ تاڑ کے درخت سو ڈیڑھ سو سے زیادہ ہی تھے لیکن وہ ابا کا حکم کیسے ٹال سکتے تھے۔ روتے جاتے اور ہر درخت کو سلام کرتے جاتے، حتٰی کہ رات ہوگئی۔ ابا بیٹھے چائے پیتے رہے جب رو رو کر سلام ختم ہوئے تو ابا نے خود ہی بلا کر کہا:

''اب آؤ چائے پی لو''

یہ کہہ کر باجی زور سے ہنس پڑیں۔ ابا کی ٹریننگ ایسی تھی۔

پھر ایک دن کہنے لگیں ''تمھیں معلوم ہے دلہن کیفی کتنے حساس ہیں۔ چاہے قیامت گزر جائے نہ تو اپنی تکلیف کا ذکر کریں گے اور نہ ہی کسی سے کوئی چیز مانگیں گے۔'' ہم بہنوں کو اماں کی سخت تاکید تھی کہ جب کیفی باورچی خانے میں پیڑھی پر کھانے بیٹھیں تو کوئی نہ کوئی بہن وہاں ضرور رہے اور اُن کے کھانے کا خیال رکھے، نہیں تو وہ بھوکے پیٹ ہی اُٹھ جائیں گے، مانگیں گے نہیں۔ واجدہ باجی

کی یہ بات میں نے گرہ میں باندھ لی، چنانچہ زندگی بھر اُن کی پلیٹ میں گوشت سبزی دال میں ہی نکالتی رہی۔ دوائیں منہ میں ڈالنا، ڈاکٹر کو دکھانا، یہ ساری ذمے داری میری تھی یا پھر بچوں کی۔کیفی نے کبھی مجھ سے بھی اپنی بیماری اور تکلیف کا ذکرنہیں کیا۔ برداشت کی ایسی غیر معمولی قوت میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔

واجدہ باجی نے یہ بھی بتایا کہ اطہر عید کے دن نئے کپڑے نہیں پہنتے تھے کیونکہ کسان بچوں کو نئے کپڑے نصیب نہیں ہوتے تھے۔ میں نے باجی سے سوال کیا:''باجی یہ بتایئے، کیفی شاعر کب بنے ؟''

باجی مسکرائیں۔۔''یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔''

میں نے ضد کی :''بتایئے نا باجی''۔

''بھئی ہوتا یہ تھا کہ ابا کی وجہ سے گھر میں شعر و شاعری ک ا حول رہتا تھا۔ ہمارے سب بھائی شاعر تھے۔ مہینے میں ایک بار گھر میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ سب بڑے بھائی اُس میں حصہ لیتے تھے۔ اطہر تیرہ چودہ سال کے تھے۔ اُن کا کام تھا محفل میں چائے پان لے جانا۔''باجی بولتی رہیں اور سین میرے ذہن کے پردے پر سنیما کی طرح چلتا رہا۔

بیٹھک میں خوب چہل پہل ہے۔فرش پر چاندنی بچھی ہے اور اُس پر سفید چاندنی اور گاؤ تکیے۔ ایک تخت جس پر قالین بچھا ہے۔اطہر کے بڑے بھائی، ظفر بھیا، اچھن بھیا، شبیر بھیا سب لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں۔ سب لوگ آہستہ آہستہ آکر بیٹھ رہے ہیں۔ اطہر کے ابا پہلے ہی سے بیٹھے اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی طرحی مشاعرہ ہونے والا ہے۔

اندر گھر کے ایک کمرے میں باجی اپنے تخت پر بیٹھی پان لگا رہی

ہیں۔شبیری (چھوٹی بہن) باورچی خانے میں چائے کے انتظام میں لگی ہوئی ہے۔اماں چھالیہ کاٹنے میں مصروف ہیں اور رحمتیہ کو ہدایت کر رہی ہیں۔

"پانی کم نہ پڑے۔جلدی جلدی لایا کر، باہر کے گھڑے بھی بھرنے ہیں۔"(دالان کے ایک کونے میں شبیر بھائی ہاتھ میں کاپی پنسل لیے ہوئے کچھ لکھنے کی سوچ رہے ہیں اور پریشان ہیں کہ غزل ہو نہیں رہی ہے۔اطہر جو باجی کے پاس کھڑے پان لگوا رہے تھے کہ باہر لے جائیں، شبیر بھائی کی طرف آتے ہیں اور شبیر بھیا سے پیار سے پوچھتے ہیں

"شبیر بھیا، کیا پریشانی ہے ہمیں بھی بتایئے۔"

شبیر بھیا: "تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔مشاعرے کا وقت سر پہ ہے اور غزل ہو نہیں رہی ہے۔"

اطہر: "بھیا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔آپ میرا نام نہ لیجیے گا۔"

شبیر بھیا (مسکرا کر) "اچھا کہو، دیکھتے ہیں تم میں کتنی صلاحیت ہے۔"

(کاپی پنسل اطہر کی طرف بڑھا دیتے ہیں)

(مصرعہ طرح تھا

ع اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے

تھوڑی دیر میں اطہر خوشی خوشی شبیر بھیا کی طرف آتے ہیں اور غزل سناتے ہیں۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے

جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے اشکِ غم
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے

مدت کے بعد اُس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

شبیر بھیا: ''کیا واقعی یہ غزل تم نے کہی ہے!اب تو تم بھی اس مشاعرے میں شریک ہو سکتے ہو۔''

اطہر: ''(دکھ سے) مجھے کون پڑھوائے گا؟''

شبیر بھیا: ''نہیں نہیں، میں ابا سے تمہاری سفارش کروں گا، چلو۔''

اطہر خوش لیکن شرماتے ہوئے محفل میں شریک ہوتے ہیں۔شبیر بھیا ابا کے کان میں کچھ کہتے ہیں۔ ابا سر ہلا کر ہاں کہتے ہیں۔مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ اطہر اپنی غزل سناتے ہیں۔محفل میں واہ واہ کا شور بلند ہوتا ہے لیکن داد اس طرح ملتی ہے گویا یہ غزل کسی اور بھائی نے کہہ کر دی ہے اور اطہر نے اس کم عمری میں جس اعتماد سے پڑھی وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس طرح کی داد پا کے اطہر بھاگ کر، اندر دالان میں جا کے باجی کے سامنے رو پڑتے ہیں۔

''باجی دیکھنا ایک دن میں بڑا شاعر بن کر دکھاؤں گا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں محنت کروگے تو ضرور بن جاؤگے، ابھی تو یہ پان باہر لے جاؤ۔''

قصہ سناتے سناتے باجی چپ ہوگئیں۔ اُنھیں کھانسی کا دورہ سا پڑا۔میں نے گھبرا کے اُنھیں سہارا دیا۔ باجی کو ٹی.بی.تھی مگر وہ بڑی ہمت والی عورت تھیں۔ وقت گزرتا گیا۔ باجی کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ پھر اُن کے شوہر آئے اور اُنھیں لکھنؤ لے گئے۔ اماں بھی اُن کے ساتھ گئیں۔گھر میں میں، بچہ، کیفی اور ابا رہ گئے۔

چار مہینے بند گھر میں رہ کر میرا دل گھبرا گیا تھا۔ میں نے کیفی سے کہا ''اب

آپ بمبئی چلیے۔‘‘ اتنے میں خبر آئی کہ باجی کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر سے ابا پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ کیفی سارا دن روتے رہے۔ کچھ دن کے بعد اماں واپس آ گئیں۔

آخر ہم نے بمبئی جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ کیفی کے پاس پیسہ کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بمبئی جا کر مجھے کہاں رکھیں گے۔ میرے ساتھ میرا آٹھ مہینے کا بچہ بھی تھا۔

پھر یہ طے پایا کہ فی الحال کیفی مجھے لکھنؤ میں، قاضی عبدالغفار صاحب (لیلیٰ کے خطوط والے)، کے گھر چھوڑ کر بمبئی جائیں گے اور وہاں کسی گھر کا انتظام کرنے کے بعد مجھے بلائیں گے۔ میں قاضی صاحب کے گھر آ گئی، وہ تو حیدر آباد میں تھے لیکن اُن کی بیوی، جنھیں سب ’آپا‘ کہتے تھے، لکھنؤ میں ہی تھیں۔ اُنھوں نے مجھے بہت پیار سے مہینے بھر رکھا۔ وہیں میری ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی جو کمیونسٹ پارٹی کی ممبر تھیں۔ وہ ہر اتوار کو پرانے کپڑوں اور پرانے جوتوں کا ایک ایک تھیلا لے کر نکلتی تھیں اور جتنے غریب کامریڈ یا اُن کی بیویاں ملتی تھیں، اُنھیں جو چیز فٹ آجاتی، دے دیتی تھیں۔ میری چپل ٹوٹ گئی تھی۔ اُن کے سینڈل مجھے فٹ آگئے۔ فوراً مل گئے۔ جن دنوں کیفی لکھنؤ میں تھے، ایک دن رشیدہ آپا اپنے شوہر محمود الظفر کا چوخانے والا کرتا پہنے ہوئے تھیں۔ کیفی نے کہا: ’’رشیدہ آپا یہ کرتا بہت خوبصورت ہے۔‘‘ اُنھوں نے فوراً کہا: ’’یہ تم لے لو۔ اس وقت تو میں اُتار کر نہیں دے سکتی، کل صبح بھیج دوں گی۔‘‘ دوسرے دن وہ کرتا کیفی کو مل گیا۔ (کیفی کی جوانی کی ایک بڑی خوبصورت تصویر ہے اُس میں وہ وہی کرتا پہنے ہوئے ہیں)۔

○

لکھنؤ سے بمبئی

کیفی مجھے لکھنؤ میں قاضی صاحب کے گھر چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد کیفی نے مجھے ایک کامریڈ کے ساتھ بمبئی بلا لیا۔ جب میں اپنے آٹھ مہینے کے بچے خیام کو لے کر پہنچی تو بمبئی کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ کمیون ٹوٹ چکا تھا۔ ہنّے بھائی کا گھر خالی ہو چکا تھا۔ اُنھیں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی نے بلالیا تھا۔ رضیہ آپا اپنی تینوں بیٹیوں نجمہ، مونا اور نادرہ کو لے کر لکھنؤ شفٹ ہو چکی تھیں۔ وہاں وہ کرامت حسین مسلم گرلز کالج میں ٹیچر ہو گئی تھیں اور اپنی بچیوں کو پال رہی تھیں۔

ہنّے بھائی کے گھر کو سردار جعفری اور سلطانہ آپا نے لے لیا تھا۔ پی ،سی .جوشی کی جگہ بی .ٹی رندیوے نے لے لی تھی۔ کامریڈوں کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ میں حیران حیران سب کو دیکھتی تھی لیکن کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ دوسری پارٹی کانگریس جو کلکتہ میں ہوئی تھی اُس میں پی سی جوشی پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ ریفارمسٹ ہیں اور کانگریس کے طرفدار ہیں وہ انقلاب نہیں لا سکتے۔ بی .ٹی رندیوے نے جو رپورٹ تیار کی تھی اُس میں انھوں نے کہا تھا ''مسلح انقلاب کا وقت آ چکا ہے۔ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔'' اِس کے برعکس پی سی جوشی نے لکھا تھا کہ ابھی عوام پوری طرح ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔

عوام میں ابھی پارٹی کا کام پوری طرح نہیں ہوا ہے ابھی عوام میں مسلح انقلاب کا شعور پیدا کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ مسلح انقلاب اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک کہ پارٹی عوام کے اندر نہ پہنچے اور مسلح انقلاب کے لیے اُنھیں تیار نہ کرے۔ لیکن زیادہ تر کامریڈ بی .ٹی رندیوے کے ساتھ ہو گئے اور پارٹی پالیسی بدل گئی۔ وہیں سے پارٹی کا زوال شروع ہوا۔ بڑے بڑے لیڈر جیل میں ٹھونس دیے گئے۔ جو بچے تھے وہ انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ مار توڑ کی وجہ سے گورنمنٹ نے پارٹی ban کر دی۔ سردار جعفری کو گھر میں سوتے سے اُٹھا کر جیل لے جایا گیا تھا۔ یہ 1949 کی بات ہے۔ کیفی کے نام بھی وارنٹ نکل چکا تھا۔ انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اب تک اُنھیں کوئی گھر بھی نہیں ملا تھا تو میرے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔

بمبئی سے حیدر آباد

میں دو دن بمبئی ٹھہر کر حیدر آباد اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ گھر کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ابا جان کا وظیفہ ہو چکا تھا۔ میرے دونوں بڑے بھائی پاکستان چلے گئے تھے۔ دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ میرے ماں باپ کے ساتھ میری چار چھوٹی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی رہتا تھا۔ میرا بیٹا اُس وقت تک گیارہ مہینے کا ہو چکا تھا۔ نہایت خوبصورت اور میٹھی شکل تھی اُس کی۔ وہ ہم دونوں کا combination تھا۔ میری تو وہ جان تھا۔ اُس کا نام کیفی کے ابا نے خیام رکھا تھا۔ سب پیار سے اُسے بھوندو پکارتے تھے۔ ایک دن اچانک اُسے بخار آ گیا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے میں نے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں مانگے اور اُسے اپنے پرانے ہومیو پیتھ ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ وہ پیسے نہیں لیتے تھے۔ اُنھوں نے

دوا دی۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر میں اُن کے پاس لے گئی۔ پھر اُنھوں نے دوا دی۔ پھر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تیسری بار پھر لے گئی۔ وہ چڑھ گئے اور مجھے جھڑک دیا لیکن دوا دے دی۔ میں روتی ہوئی بخار میں جلتے ہوئے بچے کو لے کر گھر آ گئی۔ ابا جان گھبرا گئے۔ اُنھوں نے کہا ''بیٹے اِس کو ایلو پیتھک ڈاکٹر کو دکھا دو۔'' میں نے کہا'' نہیں وہ میرے بچے کو مار ڈالے گا۔ ایلو پیتھ ڈاکٹر سے مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اندر سے یہ احساس بھی مجھے جکڑے ہوئے تھا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں اپنے ماں باپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔

خیام 26 اپریل 1948 میں پیدا ہوا تھا اور اُسے بخار 13 اپریل 1949 کو شروع ہوا۔ جب بخار بہت تیز ہو گیا اور بچے کی حالت بہت نازک ہو گئی تو چھوٹی آپا جان بھاگی ہوئی ڈاکٹر جسوریا (جو سروجنی نائیڈو کے بیٹے تھے) ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک دونوں ہی کے ڈاکٹر تھے۔ اُنھوں نے بچے کو دیکھ کر کہا'' یہ بچہ صرف بارہ گھنٹے کا مہمان ہے۔ اِسے تیسرے درجے کی ٹی۔ بی۔ ہے۔'' یہ بات اُس وقت مجھ سے چھپائی گئی تھی۔

خیام کا انتقال

شام ہوتے ہوتے 19 اپریل 1949 کو میرا بیٹا خیام مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ میری دنیا اندھیری ہو گئی۔ اُس کی سالگرہ جو 26 اپریل 1949 کو تھی۔ میں نے اُس دن کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے جالی پر کارگے کا کام کر کے کُرتا بنایا تھا۔ وہی کُرتا آنکھوں سے لگاتی۔ جہاں جہاں میرا بچہ کھیلتا تھا وہاں وہاں میں

لوٹ لوٹ کر روتی۔ اُن جذبات کا اظہار کرنا میری طاقت سے باہر ہے، ابا جان میرے ساتھ روتے جاتے تھے۔ اماں جان چپ چاپ آنسو بہاتی تھیں۔ چھوٹی آپا جان نے کیفی کو تار دیا وہ فوراً حیدرآباد پہنچے اور مجھے لے کر بمبئی واپس آ گئے۔

حیدرآباد سے بمبئی

اُس زمانے میں کیفی اور مہندر ناتھ بھیونڈی میں ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا کانفرنس کا انتظام کرنے میں پاگلوں کی طرح مصروف تھے۔ چونکہ پارٹی پر ban لگ چکا تھا اِس لیے یہ سارا انتظام انڈر گراؤنڈ کرنا تھا۔ کیفی اتنے مصروف تھے کہ اپنے بیٹے کی موت کے غم کو اندر ہی اندر پی گئے۔ جب موقع ملتا مجھے تسلی دیتے رہتے۔ بھیونڈی میں کچھ بنکر اور پارٹی کے ممبر ہاتھ بٹا رہے تھے۔ کانفرنس میں تمام بڑے بڑے ترقی پسند رائٹر، ادیب جمع تھے مثلاً مجاز لکھنوی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، راجندر سنگھ بیدی، وشوامتر عادل، حبیب تنویر، سید محمد مہدی، مُنیش نارائن سکسینہ، سلطانہ جعفری (سردار جعفری اُس وقت جیل میں تھے)، جاں نثار اختر اور اُن کی بیوی صفیہ آپا، اُن کے چھوٹے چھوٹے دو بچے جاوید اور سلمان۔ جاوید اُس وقت چار پانچ برس کے ہوں گے۔ صرف کرسیوں پر کودتے رہتے اور صفیہ آپا انھیں منع کرنے کے بجائے پیار سے دیکھا کرتی تھیں۔ سارے ادیبوں کے نام تو اِس وقت مجھے یاد نہیں ہیں لیکن تقریباً سارے ہی ترقی پسند ادیب موجود تھے۔

زہرہ جمال کی بہن اختر جمال نے بڑی پُر جوش تقریر کی ''آج ہمارے قلم،

ہماری تحریریں، ہمارے افسانے ہماری نظمیں سب سرخ ہونے چاہییں۔'' تو مجاز مسکرا کر کہنے لگے ''محترمہ، کم از کم گلابی کی تو اجازت دے دیجیے۔'' سب ہنس پڑے۔ کانفرنس کے خاتمے پر نیا مینی فیسٹو وجود میں آیا۔

کانفرنس کے دوران تو میں بہلی رہی لیکن میرا غم ناقابلِ برداشت تھا۔ کانفرنس کے بعد میں پھر سلطانہ آپا کے گھر آ گئی لیکن بچے کو بھول نہیں پا رہی تھی۔ اُس کا کرتا ہمیشہ اپنے پاس رکھتی۔ جب بھی بس اسٹاپ پر ایک سال کا بچہ دیکھتی میری ٹانگوں سے جیسے دم نکل جاتا۔ کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنے بچے کا کرتا آنکھوں پر رکھ کر وہیں بیٹھ جاتی اور رونے لگتی۔ آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ لوگ غم زدہ لوگوں سے گھبرانے لگتے ہیں اور چپ چاپ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے غم پر قابو پانے کی کوشش شروع کی۔

کیفی پھر انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے۔ میں 7 سیکری بھون میں آ گئی تھی۔ حیدرآباد سے آ کر میں نے پارٹی کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ سیکٹیرین ازم کا دور دورہ تھا۔ کامریڈوں کی وہ نرمی، پیار محبت سب رفو چکر ہو چکے تھے۔ ہر کامریڈ دوسرے کامریڈ کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا تھا گویا وہ جاسوس ہو۔ ایک تو بچے کا غم، اُس پر کامریڈوں کا یہ رویّہ۔ میرا جی گھبرا گیا۔ کیفی سے بھی کبھی بیس پچیس دن میں چوری چھپے ملنے کا موقع ملتا تھا، وہ بھی اگر کسی کامریڈ کو مجھ پر رحم آ جائے تو۔ کیفی نے مونچھیں رکھ لی تھیں تاکہ پہچانے نہ جائیں۔ میں نے دیکھا تو کہا: ''اوئی توبہ! کانسٹبل لگتے ہو۔'' خوب ہنسے۔ کئی دن تک تو کیفی راجندر سنگھ بیدی کے گھر رہے پھر پتہ نہیں کہاں کہاں رہے۔ اُس دوران میں کیفی کو بھی خوب تجربے ہوئے۔ کچھ امیر لوگ، جو بظاہر پارٹی کے ہمدرد تھے، کیفی کو دیکھ کر گھبرا جاتے اور

اُنھیں وہاں سے بھاگنا پڑتا۔ عصمت آپا لیکن سچ مچ پارٹی کے لوگوں سے پیار کرتی تھیں۔ ایک رات وہ بارہ بجے عصمت آپا کے گھر بھوکے پیاسے پہنچے۔ وہ جلدی سے باورچی خانے میں گئیں۔ فریج میں سے چار پانچ کباب نکالے۔ چار پانچ پراٹھے اُسی وقت اپنے ہاتھوں سے بنائے۔ کباب تل کر کیفی کو کھانا کھلایا۔ کھانا کھاتے ہی کیفی رات کو ایک بجے وہاں سے بھاگے۔ پولس کو شک ہو گیا تھا اور اُن کے پکڑے جانے کا خدشہ تھا۔

تمام مفلس کامریڈ 7 سیکری بھون میں بس گئے تھے۔ جہاں میں بھی تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ ہر کامریڈ اپنے کھانے کے پچاس روپے سلطانہ آپا کو ہر مہینے دیا کرے گا لیکن سوائے وشوامتر عادل کے کوئی نہیں دیتا تھا۔ وہاں حبیب تنویر، کنول نارائن اور آہو جا رہتے تھے۔ دینا بھی، جو جیل سے چھوٹ گئی تھیں، آجاتی تھیں۔ ایک کھانا پکانے والا نوکر تھا جس کو دو سو روپے تنخواہ دی جاتی تھی۔ جب پیسے ختم ہونے لگتے تو سلطانہ آپا دس کلو آلو اور دس کلو پیاز رسی میں باندھ کر لٹکا دیتی تھیں۔ بس ہر روز آلو پک جایا کرتے۔ دال اور پیاز سے روٹی کھائی جاتی، شکر پر کنٹرول تھا۔ راشن پر شکر بہت کم ملتی تھی۔ ہر کامریڈ گولڈ فلیک کے خالی ڈبے میں اپنی شکر ساتھ رکھ کر چائے پینے میز پر آجاتا۔ بہت کنجوسی سے چائے پی جاتی تھی۔ دینا کے پاس شکر کا ڈبہ نہیں ہوتا تھا۔ حبیب تنویر اپنے ڈبے میں سے ایک چمچہ شکر اُنھیں دے دیا کرتے تھے۔

پتہ چلا کہ جیل میں تمام کامریڈوں نے بھوک ہڑتال کر دی ہے۔ اُن کی ہمدردی میں پارٹی نے ایک بہت بڑا جلوس نکالنے کا آرڈر دیا۔ اُس میں اپٹا کے آرٹسٹ، مزدور، رائٹر سب ہی تھے۔ تقریباً ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔ بلراج ساہنی، اُن

کی بیوی توش جی اور دینا پاٹھک جلوس میں آگے آگے تھے۔ سب سے آگے اپٹا کا ایک لڑکا تھا، نام یاد نہیں آرہا ہے۔ کامگار میدان پہنچ کر پولس نے ہمیں روکا۔ ہم نہیں رکے اور زور زور سے نعرے لگانے لگے: "مرار جی بھائی کرسی چھوڑو جلدی چھوڑو، انقلاب زندہ باد" اور پتہ نہیں کیا کیا نعرے لگائے گئے؟ اتنے میں بندوق چلنے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ جلوس روکنے کے لیے پولس نے فائرنگ کردی۔ پولیس فائرنگ ہوتے ہی اپٹا کا وہ لڑکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پھر تو جلوس میں بھگدڑ مچ گئی۔ میری زندگی میں یہ پہلا جلوس تھا جس پر گولی چلی تھی۔ میں جو سر پر پیر رکھ کر بھاگی تو بیچاری عورتوں کو کچلتی ہوئی بھاگتی ہی چلی گئی۔ موت کا خوف بھی کیا بُرا ہوتا ہے۔ یہ احساس مجھے اُس وقت ہوا۔ میں ایک مزدور کے گھر میں گھس گئی۔ دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ مزدور عورت نے مجھے پیار سے بٹھایا پانی پلایا اُس کے شوہر نے دلاسا دیا: "بائی ڈر مت، اِدھر کوئی نہیں آئے گا۔ جب تھوڑا ٹھیک ہو گا تو ہم تم کو تمھارے گھر پر چھوڑ دے گا۔ تم کدھر رہتا ہے بائی ؟" میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا، "والکیشور روڈ، 7 سیکری بھون۔"

"اچھا اچھا ہم تم کو پہنچا دے گا۔"

مسلسل گولیوں کی آوازیں، چیخ پکار۔ پولس دینا پاٹھک، بلراج ساہنی اور توش جی کو بری طرح مار رہی تھی اور اُنھیں گھسیٹ گھسیٹ کر، گاڑیوں میں ٹھونس کر، جیل لے جا رہی تھی۔ کیفی، منیش اور مہدی مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ میرا پتہ نہیں تھا۔ جب کیفی رات بارہ بجے 7 سیکری بھون پہنچے تو میں وہاں بیٹھی ہوئی ملی۔ تب اُن کی جان میں جان آئی۔ سلطانہ آپا بھی واپس آ گئی تھیں۔ کیفی رات بھر وہاں رہے۔ پھر صبح ہونے سے پہلے ہی چلے گئے۔

اپٹا میں دھول اُڑ رہی تھی۔زیادہ تر آرٹسٹ جیل میں تھے یا پارٹی کی غلط پالیسی کی وجہ سے اپٹا سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ اُن دنوں اپٹا حبیب تنویر اور آہوجا جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جن کے نزدیک اُس وقت عوامی آرٹ کا مطلب محض نعرے بازی ہو کر رہ گیا تھا۔

شبانہ ہونے کو تھی۔ کیونکہ میرا پہلا بچہ گزر گیا تھا اِس لیے میں تو بہت خوش ہو گئی لیکن پارٹی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ آرڈر ہوا ''ابارشن کروادیا جائے۔'' کیونکہ کیفی انڈر گراؤنڈ ہیں۔ میں بے روزگار ہوں۔ بچے کی ذمے داری کون لے گا۔ مجھے بے حد تکلیف پہنچی۔ اِس بات پر جب ایک میٹنگ ہوئی تو اُس میں میں نے کہا ''یہ بچہ مجھے چاہیے اور جیسے بھی ہو میں اِسے پالوں گی۔'' مجھ سے بہت کچھ کہا گیا لیکن میں اپنی جگہ اڑ گئی تھی۔اُس میٹنگ میں صرف ہمارے دوست مہدی نے میرا ساتھ دیا۔ آخر پارٹی نے مجھے یہ بچہ پیدا کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اِس وقت تو میں اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی اور واپس آکر کوئی نوکری یا کام دیکھوں گی۔ چنانچہ میں حیدرآباد چلی گئی۔

O

بمبئی سے حیدر آباد

حیدر آباد میں میری ماں نے مجھے گلے لگا لیا۔ میرے تمام چھوٹے بہن بھائی میری نظروں کو دیکھتے رہتے اور بھاگ بھاگ کر میرا کام کرتے تھے۔ اُسی زمانے کا ایک دل چسپ واقعہ ہے۔

کمیونسٹ پارٹی نے ایک اپیل جاری کی تھی کہ لوگوں سے peace movement کے اعلان نامے پر دستخط لے کر بھیجا جائے۔ رضا کاروں کا زمانہ کچھ ہی سال پہلے ختم ہوا تھا۔ میں اور باجی (اختر بھیا کی بڑی بہن جمال النسا) حیدر آباد کے ایک مڈل کلاس گھر میں گھس گئے۔ ہم نے دیکھا کہ دالان میں ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ دوسرے دالان میں دو عورتیں کھانا پکانے میں مصروف ہیں۔ میں اور باجی کھڑے رہے۔ عورت نے پوچھا، ''آپ لوگاں کاں سے آئے ماں اور کائے کو آئے؟'' باجی نے بہت نرم لہجے میں کہا، ''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہم بیٹھ جائیں۔ آپ لوگوں سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' میری طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ کیفی اعظمی کی بیوی ہیں اور میرا نام جمال النسا ہے۔ میں لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سکھاتی ہوں۔'' عورت ذرا نرم ہوئی اور بولی، ''بیٹھو بیٹھو۔''

ہم وہیں دری پر بیٹھ گئے۔ باجی نے اپیل نکالی اور بولیں، ''آپ کو تو معلوم

ہے کہ جنگ کے کتنے ہولناک اثرات ہوتے ہیں۔ ابھی ابھی رضاکاروں اور انڈین یونین میں جنگ ہوئی تھی۔ کتنے جوان لڑکے مارے گئے۔ کتنی جوان لڑکیوں کی آبرو ریزی ہوئی۔ اِس لیے ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں جنگ کبھی نہ ہو۔ ہمیشہ امن قائم رہے۔" وہ عورت ذرا بور ہونے لگی۔ اتنے میں باجی نے اپیل نکالی اور کہا "اِس پر آپ دستخط کردیں۔ اِس میں لکھا ہوا ہے کہ جنگ کبھی نہ ہو، ہمیشہ امن قائم رہے۔" وہ عورت دستخط کرنے کے نام سے چونک گئی اور زور سے اپنی بھابی کو پکارا، "اجی بھابھی جان، اِنو بول رئیں اَمن کتے کی جنگ کتے کی دستخط کرنا کتے۔" اُدھر سے بھابھی جان دال بگھارتے ہوئے بولیں، "ائی ہم عورتاں مردوں سے پوچھے بغیر کیسا دستخط کریں گے؟ اُن کو بولو۔ ابھی آپ جاؤ۔ کل آنا۔ ہم مردوں سے پوچھ کر دستخط کریں گے۔"

میں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو روکتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر آکر خوب ہنسی۔ میں نے باجی سے کہا، "یہ دستخط کا کام آپ ہی سنبھالیے۔ مجھے تو معاف ہی کیجیے۔" لیکن باجی مایوس نہیں ہوئیں۔ وہ اکیلے ہی گھر گھر جاتی رہیں اور اپیل پر دستخط کراتی رہیں۔

باگو دائی

مجھے حیدرآباد آئے ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ جب میرا ساتواں مہینہ شروع ہوا تو اماں جان نے کہا کہ باگو دائی کو بلا کر دکھا دیتے ہیں کہ بچے کی

پوزیشن ٹھیک ہے یا نہیں۔ باگو دائی بھی اُس زمانے میں کسی بڑی سے بڑی لیڈی ڈاکٹر کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ عورتیں لیڈی ڈاکٹر سے زیادہ باگو دائی پر بھروسہ کرتی تھیں۔ وہ بھی اپنی طرح کا ایک کیریکٹر تھی۔ پچپن یا ساٹھ سال کی عمر ہوگی۔ نمکین چہرہ، سانولا رنگ، گلے میں تلنگانہ کا حسین زیور جسے گُٹا پُستل کہتے ہیں۔۔ آج کل تو بہت فیشن میں ہے۔ آج اُس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ اُس وقت وہ شاید صرف دس پندرہ ہزار کا ہوگا۔ کانوں میں سونے کی کِنٹیاں (ایک طرح کا حیدرآبادی زیور)، کھچڑی بال، پان سے ہونٹ لال، مسکراتا چہرہ لیکن دونوں آنکھوں سے اندھی۔ اپنی پوتی کے ساتھ رکشا میں آئی تھی۔ میرے پیٹ کو خوب دبا دبا کر دیکھا اور بولی ''بی بی آپ کبی دوا خانے کو نکو جاوَ۔ بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ دوا خانے میں کیسی کیسی لیڈی ڈاکٹراں دیکھتیں۔ ذرا تکلیف ہوئی تو کلورو فارم سنگھا دیتیں۔ پرسوں پرسوں زہرہ بیگم ٹیچر کو کلوروفارم سنگھا دیئے۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد ہوش میں لانے کو آکسیجن ڈھونڈے تو پورے عثمانیہ دواخانے میں آکسیجن کا ایک سلینڈر نئیں ملا۔ بیچاری بیٹے کا منہ دیکھے بِنا ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔'' میرا تو ڈر کے مارے دم نکل گیا۔ مجھے ویسے ہی ہاسپٹل کے نام سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے کہا ''باگو تم ہی آوَ۔''

اماں جان نے اُس کو پان کا بیڑا تھماتے ہوئے کہا: ''باگو، کوئی ڈرنے والی بات تو نہیں ہے نا؟''

باگو نے جواب دیا ''ارے نئیں پاشا، میں جھوٹ کائے کو بولوں گی۔ بھگوان کی دیا سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو بھوت دناں ہیں۔ منجھلے پاشا (چھوٹی آپا جان) کو میرا گھر معلوم ہے۔ میں جلدی اچ آجاوُں گی۔''

شبانہ کی پیدائش

دو مہینے گزر گئے۔ سترہ ستمبر 1950 کی رات کو تکلیف شروع ہوئی۔ اماں جان نے فوراً باگو کو بلوایا۔ وہ اپنی پوتی کے ساتھ آدھے گھنٹے میں آ پہنچی۔ رات کے پونے تین بجے شبانہ صاحبہ تشریف لے آئیں۔ اماں جان، کیفی، چھوٹی آپا وغیرہ سبھی موجود تھے۔ اماں جان نے چاول گیہوں تولنے والی ترازو میں شبانہ کو رکھ کر تولا۔ پونے آٹھ پونڈ کی تندرست پیاری بچی۔ باگو نے نہلا دھلا کر، کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دکھایا۔ میں نے دیکھا، ایک پیاری سی بچی، بڑی بڑی آنکھیں، ننھا سا گلابی دہانہ، سر میں گھنے کالے بال، تندرست، گورا رنگ۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اماں جان نے باگو کو کچھ روپے اور ایک ساڑی دی۔

عصمت آپا اور اُن کے شوہر شاہد لطیف اُن دنوں فلمیں بناتے تھے۔ شاہد بھائی نے کیفی سے دو گانے لکھوا کے مجھے ایک ہزار روپے بھیجے تھے۔ عصمت آپا نے پہلے بھی، جب شبانہ ہونے والی تھی، میری بڑی مدد کی تھی۔ میں بے حد کمزور تھی۔ مجھے اُنھوں نے پندرہ دن اپنے گھر میں رکھا اور ڈاکٹر کو بلا کر مجھے طاقت کے انجکشن لگوائے تھے۔

عصمت آپا مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ وہ کیفی اور مجھے بہت چاہتی تھیں۔ زندگی میں کئی بار اُنھوں نے ہماری بہت مدد کی ہے۔

○

حیدر آباد سے بمبئی

شبانہ جب چار مہینے کی ہوئی تو کیفی آکر مجھے بمبئی لے گئے۔ اُس وقت تک پارٹی پر سے پابندی اُٹھ چکی تھی۔ ڈممکر روڈ کی ایک چال میں چوتھے منزلے پر کیفی کے ایک دوست مسعود صدیقی نے تیس روپے ماہوار میں دو کمرے دلوادیے تھے۔ شکر ہے کہ باورچی خانہ دوسرے کمرے میں تھا۔ میری شرط یہ تھی "میں ہر بات کے لیے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں لیکن جس کمرے میں رہوں گی اُسی کمرے میں کھانا نہیں پکاؤں گی۔" یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ ایسا گھر حاصل کرنے کے لیے کیفی کو کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ چال کا ماحول تھا۔ پہلے کرائے دار نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا تھا تو اِن کمروں کی بجلی کٹی ہوئی تھی۔ کمروں کی آدھی دیواریں پان کی پیک اور مرے ہوئے کھٹملوں کے خون سے لپی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ دیواروں اور دروازوں کو برش سے گھِس گھِس کر دھویا اور کمرے کو خوب صاف کیا۔ اپنی پرانی ساڑی کاٹ کے پردے بنائے اور کھڑکیوں پر لگادیے۔

میں نے پرتھوی تھیٹر میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ روز صبح نو بجے شبانہ کو کندھے پر لاد کر، پرتھوی تھیٹر لے جاتی جو اوپیرا ہاؤس

میں تھا اور دوپہر میں دو بجے واپس آکر کھانا پکاتی۔ اکثر بس میں آتے ہوئے میرے پرس میں صرف دس نئے پیسے ہوتے تھے اور میرا دل دھڑکتا تھا کہ اگر یہ سکہ کھوٹا نکلا تو مجھے اِن سارے مسافروں کے سامنے اِس بس سے بے عزت ہو کے نیچے اُترنا پڑے گا۔ شکر ہے کبھی سکہ کھوٹا نہیں نکلا۔ شام کو پانچ بجے ایک لڑکے کو ٹیوشن پڑھاتی۔ اُس سے پینتالیس روپے مل جاتے۔ جب ناگپور ٹور پر گئی تو پردے اور بیڈ کوَر خرید لیے، جو پندرہ پندرہ روپے میں مل گئے تھے۔ منیش کے ساتھ ہیننگ گارڈن جاکر چمپا کے پھولوں کی ٹہنیاں توڑ کر لاتی اور گلدان میں سجاتی۔ منیش کو نزدیک کے چور راستے معلوم تھے اِس لیے ہم دونوں پیدل جاتے اور ٹہنیاں لے کر پیدل ہی آتے تھے۔

ایک مرتبہ، میری ماں، اختر بھائی اور اُن کی بیوی چھوٹی آپا جان پہلی بار بمبئی آئے اور ہمارے گھر ٹھہرے۔ گرمی سخت تھی۔ بجلی کٹ جانے کی وجہ سے پنکھا بھی نہیں تھا۔ لال ٹین اور مٹی کے تیل کی ڈِبری جلتی تھی۔ مٹی کے تیل کی بُو سارے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ گرمی سے پریشان ہوکر ساری رات یہ لوگ چوپائی پر بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے اُنھوں نے حیدرآباد واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے کوئی خاص شرمندگی نہیں تھی کیونکہ اِس زندگی کو میں نے کوئی مصیبت نہیں جانا تھا۔ ہندستان کے کروڑوں لوگ اِس سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ مگر میری بدحالی دیکھ کر میری ماں کو بہت تکلیف ہوئی۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن جاتے ہوئے میرے تکیے کے نیچے پانچ سو روپے رکھ کر چلی گئیں۔ میں نے کبھی اپنے ماں باپ سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ نہ اپنی تکلیف کا اظہار کیا اور نہ کبھی مجھے اِس بات کا افسوس ہوا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

کیفی اُس زمانے میں زیادہ تر وقت مزدوروں کے محلے مدن پورہ میں گزارتے تھے۔ اُن ہی کے ساتھ فٹ پاتھ پر بان کے جھلنگے پلنگ پر لیٹ کر نظمیں لکھتے۔ 'مکان' اُسی دور کی لکھی ہوئی نظم ہے جو بہت مشہور ہوئی جسے شاہد لطیف نے اپنی فلم 'سونے کی چڑیا' میں استعمال بھی کیا تھا۔

مکان

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اُٹھو، میں بھی اُٹھوں، تم بھی اُٹھو، تم بھی اُٹھو
کوئی کھڑکی اِسی دیوار میں کھُل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اُتارے ہم نے
اِن مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
اُن دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور، ذرا اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیے اِس لیے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لیے

اپنی نس نس میں لیے محنتِ پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا ہے اُسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

ڈمٹمکر روڈ سے ریڈ فلیگ ہال میں منتقل ہونا

ڈمٹمکر روڈ پر چھ مہینے رہنے کے بعد، 1951 میں سردار بھائی اور منیش کی کوششوں سے، ہم کو پرارتھنا سماج پر واقع ریڈ فلیگ ہال میں ایک کمرہ مل گیا جو پارٹی کی ہی ملکیت تھا۔ ریڈ فلیگ ہال دراصل ایک بڑا سا فلیٹ تھا۔ جس کا ڈرائنگ روم پارٹی کی میٹنگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ آٹھ کمرے تھے۔ ہر کمرے میں ایک کامریڈ کی فیملی رہتی تھی۔ ہر کمرے کا کرایہ پچاس روپے دینا پڑتا تھا۔ یہ کمرہ ڈمٹمکر روڈ والے کمرے کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ دوسرے کمروں کے برعکس اس میں بالکنی نہیں تھی۔ کھانا کمرے ہی میں پکانا پڑتا

تھا۔ جس کے لیے میں کسی طرح اپنے کو تیار نہیں کر پاتی تھی۔ میں نے کیفی سے صاف کہہ دیا ''میں اُس کمرے میں ہرگز کھانا نہیں پکاؤں گی جس میں میں رہتی ہوں۔'' سردار بھائی نے کہیں سُن لیا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے'' موتی، تم ایسا کرو، جو ہمارے کمرے کے پیچھے گلیاری سی ہے، تم اُس میں کھانا پکا لیا کرو۔'' خوشی سے میرے آنسو نکل پڑے۔ کوئی تو ہے جس کے دل میں رحم ہے اور جو دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتا ہے۔ اُس کی تکلیف کے بارے میں سوچتا ہے۔ میں نے فوراً اپنا کچن اُس گلیاری میں منتقل کر لیا۔ یہاں بھی تکلیف یہ تھی کہ وہ راستہ بھنگن کے آنے جانے کا تھا۔ میری پیٹھ کے پیچھے سے وہ اپنی جھاڑو اور بالٹی لیے گزرتی تھی۔ جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ایک بالکنی والا کمرہ خالی ہوگیا۔ اُس میں رہنے والے کامریڈ کسی اور شہر چلے گئے تھے۔ منیش اکیلے تھے۔ ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اِس لیے اُنھوں نے مجھ سے کہا ''موتی، میں اُس کامریڈ کے کمرے میں منتقل ہو جاتا ہوں۔ تم میرا کمرا لے لو۔ وہ نسبتاً بڑا ہے۔'' میں خوشی سے اُچھل پڑی۔ اُن کا شکریہ ادا کیا اور اپنا سارا سامان اُٹھا کر میں اُن کے کمرے میں لے گئی۔ پھر تو جیسے میرے عیش ہوگئے۔ اُس کمرے کو میں نے آہستہ آہستہ سجانا شروع کیا۔ بالکنی میں ایک طرف سلیقے سے اپنا چولہا اور برتن رکھے۔ دروازے کے سامنے والے حصے میں ایک کھانے کی میز اور چار کرسیاں لگا دیں، جو میں چور بازار سے دس روپے ماہانہ قسط پر لے آئی تھی۔ اُس وقت میز کرسی کی قیمت بہت کم ہوا کرتی تھی یعنی مجھے کھانے کی میز پینسٹھ روپے میں اور کرسیاں پندرہ پندرہ روپے میں مل گئیں۔ میں نے بڑھئی کو بلا کر، کھانے کی میز کے سامنے، بانس کا سہارا دے کر، ایک چٹائی لگائی۔ اُس پر منی پلانٹ چڑھایا۔

اب میرا کھانے کا کمرا مکمل ہوگیا تھا۔ پرتھوی تھیٹر کے ساتھ میں جب بھی ٹور پر جایا کرتی تو کچھ خوبصورت پردے اور چادریں خرید لیا کرتی تھی۔ میرے پاس دو بڑے پلنگ تو تھے ہی، چور بازار سے ایک برس کی شبانہ کے لیے ایک چھوٹا سا پلنگ بھی خرید لیا۔کچھ دنوں کے بعد ایک سو دس روپے میں ایک الماری خریدی اور پھر کیفی کے لیے میز اور کرسی۔میرے پاس دو لوہے کے صندوق تھے جن میں چادریں وغیرہ رکھا کرتی تھی۔ اُن صندوقوں پر پرانی رضائیاں رکھ کر خوبصورت چادریں بچھا دیں۔یوں مہمانوں کے لیے صوفہ بن گیا۔ ایک کونے میں یو۔پی سے لایا ہوا ایک سوپ ٹانگ دیا۔جس میں بچوں کی تصویریں لگا دیں۔ میں چونکہ اپنے بلاؤز خود سیتی ہوں اس لیے بہت سارے کپڑوں کے ٹکڑے میرے پاس تھے۔ اُن کو خالی وقت میں بیٹھ کر جوڑ جوڑ کر ایک پردہ تیار کیااور اُسے کمرے کی ایک دیوار پر پینٹنگ کی طرح لگا دیا۔اِس طرح میرے کمرے کا ڈیکوریشن مکمل ہوگیا۔کیفی بہت خوش ہوئے۔ پورے کمیون میں میرا کمرا سب سے خوبصورت مانا جاتا تھا۔آنے جانے والے یہ ضرور پوچھتے کہ یہ کمرہ کس کا ہے۔ اِس کمرے میں میں نے اپنے دونوں بچوں اور کیفی کے ساتھ پورے نو سال گزارے۔

○

کملا بائی

ریڈ فلیگ ہال پرارتھنا سماج میں تھا اوراو پیرا ہاؤس سے بہت قریب تھا۔ دس منٹ کا راستہ تھا۔ میں پیدل ہی تھیٹر چلی جاتی۔ صبح نو بجے تھیٹر شروع ہوتا اور دو بجے تک ختم ہو جاتا تھا۔ میں ساڑھے آٹھ یا پونے نو بجے نکلتی اور وقت پر پہنچ جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک آیا، ایلس، مل گئی اور مجھے شبانہ کو ساتھ لے جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ میں اکثر شارٹ کٹ سے جاتی تھی۔ یہ راستہ پولس اسٹیشن کے پچھواڑے سے نکلتا تھا جو گاڑیوں کے لیے بند تھا۔ لوگ پیدل ہی جاتے تھے، گاڑیاں وغیرہ نہیں جاتی تھیں۔ وہ تھوڑا سا محفوظ فٹ پاتھ تھا۔

میں روز ایک تیس پینتیس سال کی عورت کو دیکھتی تھی جو میونسپل نل سے بالٹی میں پانی بھر کر، وہاں کھڑی ٹیکسیوں کو دھوتی تھی۔ اُس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکوں کی عمر کوئی آٹھ اور چھ سال اور لڑکی کی عمر شاید پانچ سال ہوگی۔ میں جب بھی وہاں سے گزرتی تو اکثر اُسے اپنی بچی کے بالوں میں کنگھی کرتے دیکھتی تھی۔ اُس کا چولہا سامنے کی دکان کے نیچے کے حصے میں رکھا ہوتا تھا۔ شاید دکان دار نے رحم کھا کے اُسے رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اُس کا شوہر بھی نظر آجاتا تھا جو کچھ کام چور سا لگتا تھا۔ اکثر سوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ٹیکسی

دھوتا نظر آتا تھا۔ اُس عورت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مجھے جب بھی موقع ملتا، رک کراُس سے باتیں کرتی۔ اگر جلدی میں نہ ہوتی تو کھڑے ہو کر اُس سے باتیں کرنے لگتی۔ اُس کا نام کملا بائی تھا۔وہ مدراس کے کسی گاؤں کی تھی۔ روزی روٹی کی تلاش میں بمبئ آ گئی تھی۔ اپنی محنت سے پیسے کماتی تھی۔ بچوں کو انگلش اسکول بھیجتی تھی۔سستا زمانہ تھا۔ بچوں کی فیس بھی زیادہ نہیں تھی۔وہ خود تھوڑی پڑھی لکھی تھی۔ اُس کا صاف ستھرا پن اور بچوں کو اسکول بھیجنا مجھے بہت متاثر کرتا تھا۔ ہمیشہ خوش اور مصروف نظر آتی۔ کبھی کبھی دو دو تین تین مہینے اُس کا شوہر غائب رہتا۔ میں پوچھتی ''تمھارا شوہر کہاں ہے'' تو کہتی :'' ارے بائی اُس کا بھروسہ کیا! جب جی چاہتا ہے آجاتا ہے اور جب جی چاہتا ہے گاؤں بھاگ جاتا ہے۔ میں گاؤں نہیں جاتی کیونکہ وہاں اسکول نہیں ہے اور میں بچوں کو پڑھا لکھا کر اُن کی جندگی بنانا چاہتی ہوں۔ یہاں گھر کس کو ملتا ہے؟ یہاں کے لوگ سب اچھے ہیں جو مجھے رہنے کو جگہ دیا''

ایک مرتبہ میں نے پوچھا ''برسات میں تم کیا کرتی ہو؟''

وہ بولی ''بارش کا ٹیم ہم لوگ اسی دکان کے نیچے سو جاتے ہیں۔وہاں پانی نہیں آتا۔سامنے سے تھوڑا آتا ہے پَن ہم لوگ پلاسٹک ڈال کر کام چلا لیتے ہیں۔ٹھنڈی کا ٹیم میں بھی ہم سب وہیں سوتا ہے۔گرمی میں فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔یہاں کا آدمی لوگ اچھا ہے۔'' میرے دل میں اُس عورت کے لیے ایک عزت سی پیدا ہوگئی۔

اُس زمانے میں کیفی نے نوجوان مصنفین کے لیے ایک young writers association بنائی تھی۔ یہ لوگ اتوار کو ریڈ فلیگ ہال میں

چار بجے جمع ہو کر اپنی کہانیاں نظمیں پڑھتے جن پر تنقیداور بحث وغیرہ ہوتی۔ ساگر سرحدی، گلزار، لاجپت رائے اور مدن پورہ کے ظفر گورکھپوری کے علاوہ اور بھی نوجوان بچے آیا کرتے تھے۔ساگر سرحدی تو اِپٹا کے لیے ڈرامے بھی لکھا کرتے تھے۔ ایک دن میں اُن کو اپنے ساتھ کملا بائی سے ملانے لے گئی اور اُن سے کہا ''اس کی زندگی پر ایک ڈرامہ لکھو۔'' وہ بھی بہت متاثر ہوئے اور اُنھوں نے اُس کی زندگی پر ایک ڈرامہ 'بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا' لکھا۔ یہ ڈرامہ انٹر کالجیٹ کامپٹیشن میں کئی بار کھیلا گیا۔اُسے رمیش تلوار نے ڈائرکٹ کیا تھا۔

اُس عورت کے بچے وہیں بیمار پڑتے۔ چوتھی بیٹی بھی اُسی دکان کے نیچے پردے لگا کر پیدا ہوئی۔کوئی دائی وغیرہ قسم کی عورت آجاتی۔ کملا بائی نے مجھ سے کبھی پیسے نہیں مانگے اگر میں کبھی اُسے کچھ پیسے دینا بھی چاہتی تو وہ ہرگز نہیں لیتی تھی۔

بہت دنوں بعد جب ہم جُوہُو منتقل ہو گئے تھے۔ بچے بڑے ہو کراپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں ایک دن کولہا پوری چپل خریدنے کے لیے پرارتھنا سماج گئی۔ پھر سوچا کہ تھوڑی سبزی بھی لیتی چلوں۔ مارکیٹ میں گئی تو دیکھا کملا بائی ایک دکان پر بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ بال تھوڑے سفید ہونے لگے تھے۔ مجھے تعجب ہوا میں نے پوچھا:'' کملابائی تم یہاں کیسے، تمھارے بچے اور شوہر کہاں ہیں؟''

وہ مسکرا کر بولی:'' بائی، میرے بچے تو بڑی بڑی نوکریوں پر لگ گئے ہیں۔ اُن کے پاس فلیٹ ہیں۔ میں اُن کے ساتھ رہتی ہوں لیکن کبھی کبھی اپنا پرانا جگہ آنے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں اتنا لمبا جندگی گزارا، میرے کو فلیٹ میں اچھا نہیں لگتا

اِس لیے یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اِن لوگوں سے باتیں کر کے مجھے اچھا لگتا ہے۔"

میں وہاں سے چلی تو آئی لیکن کملا بائی آج بھی یاد آتی ہے۔

ریڈ فلیگ ہال اور سردار جعفری

مجھے اِس بات پر فخر ہے کہ میں نے سردار جعفری کو قریب سے دیکھا ہے۔ ریڈفلیگ ہال میں جہاں ہم اور ہمارے بچوں نے نو سال گزارے، ہمارا کمرہ جعفری صاحب کے کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ اِن نو برسوں میں مجھے اُن کی انسان دوستی، رحم دلی، اپنے بیوی بچوں اور بہنوں سے پیار دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے ایک کمرے والے گھر میں اُن کا زیادہ سے زیادہ وقت لکھنے پڑھنے والی میز پر گزرتا۔ اُسی میز سے وہ اُردو لٹریچر میں غیر معمولی اضافہ کرتے تھے۔ وہیں سے وہ روس بھی جاتے اور ہم لوگوں کے لیے مختلف تحفے بھی لاتے۔ ٹی کوزی ہمیشہ میری کمزوری رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار سردار بھائی روس سے میرے لیے نہایت خوبصورت فراک پہنی ہوئی گڑیا والی ٹی کوزی لے کر آئے تھے۔ میری خوشی کی حد نہ تھی۔ کیونکہ ہندستان میں اس طرح کی ٹی کوزی نہیں بنتی تھی۔ وہ ٹی کوزی میرے ٹی سیٹ کی شان میں اضافہ کر رہی تھی۔ گو میں ایک کمرے کی زندگی گزار رہی تھی لیکن میرا ٹی سیٹ ہمیشہ انتہائی خوبصورت بون چائنا کا ہوتا۔ ٹرے کلاتھ کے اوپر ٹی کوزی ہمیشہ چائے کی کیتلی پر ڈھکی ہوتی اور میں ہمیشہ خوبصورت پیالوں میں چائے پیتی کیونکہ میری ماں کے گھر میں چائے اِسی طرح پی جاتی تھی۔

اکثر میں پرتھوی تھیٹر سے دو بجے لوٹتی اور کھانا کھا کر سو جایا کرتی۔ میری آنکھ کھلتی تو میں کبھی کبھار سردار بھائی کو اپنے کمرے میں کیفی کے لکھنے کی میز پر کچھ ڈھونڈتا ہوا پاتی۔ میں پوچھتی" آپ کو کیا چاہیے سردار بھائی ؟" تو وہ مسکرا کر کہتے "کیفی اپنی نظموں کی طرف سے بہت لاپرواہ ہیں۔ کبھی سگریٹ کی ڈبیہ کے کنارے پر کچھ لکھ دیتے ہیں۔ کبھی ماچس کی ڈبیہ پر یا کسی کاغذ کے پُرزے پر۔ میں ایسی ہی کسی چیز کی تلاش کرنے کے لیے یہاں آتا ہوں تاکہ کیفی کی کوئی نظم مل جائے تو میں چھاپ سکوں۔"

اُن کی دونوں بہنوں، رباب جعفری اور ستارہ جعفری، سے میری اچھی خاصی دوستی تھی۔ سردار بھائی نے اپنے ماں باپ کے انتقال کے بعد اُنھیں بلرام پور سے اپنے پاس بمبئی بلالیا تھا۔ دونوں بہنیں انتہائی ذہین اور independent تھیں۔ ایک دن اتفاق سے میرے گھر میں بالکل پیسے نہیں تھے۔ کھانا بھی نہیں پکا تھا۔ ربّو باجی نے سردار بھائی سے کہہ دیا،" شاید شوکت نے کھانا نہیں کھایا ہے۔" سردار بھائی نے فوراً ربّو باجی سے کہا کہ شوکت کو کھانے کے لیے بلا لو۔ مجھے رونا آ گیا اور میں نہیں گئی۔ میں نے کہہ دیا میں کھا چکی ہوں۔ شام کو سردار بھائی کمرے میں آئے۔ چپکے سے سو روپے کیفی کی میز پر رکھ کر چلے گئے۔ دو مرتبہ کیفی کو موت کے منہ سے چھڑا کر لانے والے بھی سردار بھائی اور اُن کی بیوی سلطانہ آپا ہی تھے۔

شبانہ جب تین سال کی ہوئی تو سلطانہ آپا جو اُس وقت تعلیمِ بالغاں کی انسپکٹریس تھیں، اپنے دونوں بچوں پپو اور چُتم، کے ساتھ شبانہ کو بھی میونسپل اسکول میں شریک کروادیا۔ توبہ، شبانہ کو اسکول کی بس میں بٹھانا بھی ایک کارِ دارد تھا۔ اِس بچی کو اُس اسکول سے اتنی نفرت تھی کہ رو رو کر آپا کی گود سے اُچھل کر زمین پر بیٹھ

جاتی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زمین سے چپک جاتی۔ آیا کے گھسیٹ کر لے جانے پر بھی نہیں جاتی۔ پھر دو لوگ گود میں اُٹھا کر بس میں بٹھا دیتے۔ جب امتحان کا نتیجہ سامنے آیا تو میں پریشان ہوگئی۔ ہر سبجیکٹ میں گول گول انڈے۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو سلطانہ آپا سے کہا: ''میں تو اپنی بچی کو اِس اسکول میں نہیں بھیجوں گی۔'' سلطانہ آپا نے تینوں بچوں کو اسکول سے نکلوالیا۔ کیفی نے کہا ''میں شبانہ کو کوئین میری ہائی اسکول میں شریک کراؤں گا۔'' میں نے سنا تو گھبرا گئی۔ ''ارے باپ رے باپ، اُس کی فیس تو ۳۰ روپے ہے۔ وہ کہاں سے دوں گی۔'' کیفی کہنے لگے: ''تم اِس کی فکر نہ کرو۔ اپنی بیٹی کی پڑھائی کے لیے میں پیسے کماؤں گا۔'' کوئین میری کا ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ داخلے کے لیے یہ شرط تھی کہ بچوں کے ماں باپ کو انگریزی آنی چاہیے۔ جو ہم دونوں کو نہیں آتی تھی۔ چنانچہ شبانہ کا داخلہ کروانے سلطانہ آپا اُس کی ماں اور مُنیش نارائن سکسینہ کیفی اعظمی بن کر گئے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنی سی شبانہ کوئین میری میں جاتے ہی ایک مختلف بچی بن گئی۔ ہر رپورٹ فرسٹ کلاس۔ ڈراموں میں بھی حصہ لینے لگی تھی۔ جب دس سال کی ہوئی تو شیکسپیئر کے ڈرامے 'جولیس سیزر' کے لیے اپنے ابّا کا سلک کا کرتا چھپا کر لے گئی۔ اِس ڈرامے میں اُس نے مارک انتھونی کا کردار ادا کیا۔ وہیں سے دراصل اُس کی صحیح تربیت شروع ہوئی۔ اِس کے لیے میں سلطانہ آپا کا جتنا بھی احسان مانوں کم ہے۔

جب میرا بیٹا ہونے والا تھا تو سلطانہ آپا نے میرا نام سینٹ جارج ہاسپٹل میں لکھوادیا۔ وہ سرکاری ہاسپٹل تھا اِس لیے چیک اپ وغیرہ کے پیسے خرچ نہیں ہوتے تھے۔ جب ڈلیوری قریب آئی تو گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ کیفی سامنے پان کی

دکان والے سے پانچ روپے قرض لے کر مجھے ٹیکسی میں ہاسپٹل لے گئے۔ ۱۴ ستمبر 1953 کو میرا بیٹا بابا پیدا ہوا۔ بیٹے کو دیکھ کر خوشی سے میں اپنی ساری تکلیف بھول گئی۔ آٹھ پونڈ کا، تندرست، پیارا سا بچہ، سر پر گھنے بال، خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں اور اونچی ناک۔ دوسرے دن صبح صبح کیفی اپنے دوست منیش کے ساتھ آئے۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ پانچویں دن مجھے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ کیفی جب مجھے لینے آئے تو شبانہ اپنی آپا کے ساتھ نیچے ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔ شبانہ اُس وقت تین سال کی ہوگئی تھی۔ جب میں کپڑے میں لپٹی ہوئی چھوٹی سی پوٹلی کو گود میں لیے نیچے اُتری تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے اُسے بتایا کہ یہ تمھارا بھائی ہے۔ یہ سنتے ہی وہ زور سے ہنس پڑی اور بچے کو گود میں لینے کی ضد کرنے لگی۔ میں نے اُس کو سمجھایا کہ بیٹے یہ گر جائے گا۔ تب تک گھر آ گیا۔ آپا نے بیٹے کو گود میں لے لیا اور ایک فلور چڑھ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ خوشی سے میرے آنسو نکل پڑے۔ مجھے لگا کہ خدا نے میرے پہلے بیٹے کو واپس میرے پاس بھیج دیا ہے۔ اتنے میں سب لوگ بچے کے اطراف جمع ہو گئے۔ سلطانہ آپا کہنے لگیں ''بالکل کیفی کی شکل کا ہے۔''

کیفی مزدوروں کے محلے مدن پورہ جاتے اور مزدوروں کے لیے کام کرتے تھے۔ اپنے لیے کام بھی ڈھونڈتے رہے تھے۔ کبھی کبھی چھوٹے پروڈیوسر مثلاً نانو بھائی وکیل یا لیکھ راج بھاکڑی وغیرہ کی فلموں کے لیے گانے یا کہانی لکھنے کا کام مل جاتا۔ پوری اسکرپٹ اور گانوں کا معاوضہ پانچ ہزار روپے ملتا تھا۔ جس میں کچھ مہینوں تک ہماری فیملی کا گزر بسر ہو جاتا تھا۔ شبانہ کی فیس اور آپا کی تنخواہ اُسی میں سے دی جاتی۔

بچوں کی آیا، ایلس، اِن کی دیکھ بھال بالکل ماں کی طرح کرتی تھی۔ اُس کا ایک دل چسپ واقعہ ہے۔ شبانہ سات سال کی اور بابا چار سال کا تھا۔ ہمارے گھر سے قریب پارسیوں کا ایک شادی خانہ تھا۔ ایلس دونوں بچوں کو خوبصورت کپڑے (میں غریبی کے باوجود دونوں بچوں کی سالگرہ کے کپڑے انتہائی اسمارٹ اور خوبصورت بناتی تھی) پہنا کر روز شام کو شادی خانے میں لے جاتی اور مفت میں کوکا کولا اور آئس کریم کھلا پلا کرواپس لے آتی تھی۔ ایک دن چوکیدار کو شک ہوا۔ اُس نے ایلس کو روکا: ''اے تم کدھر جاتا ہے،ادھر آؤ، ہم روز دیکھتا ہے تم ہر دن اِن بچوں کو لے کر ہر شادی میں آتا ہے۔ کیا ہر شادی میں شادی کا لوگ کے ساتھ تمھارا رشتہ داری ہے؟ بھاگو، ابھی ادھر آنے کا نہیں۔ نہیں تو ہم بڑے ساب سے تمھاری شکایت کرے گا۔'' ایلس تھوڑی شرمندہ ہوئی پھر بچوں کی انگلیاں پکڑے پکڑے بڑبڑاتی ہوئی نکل آئی: ''ارے بچہ لوگ تھوڑا کھا لے گا تو تمھارا باپ کا کیا جاتا۔ سالا لوگ دم ڈانٹ دیتا ہے۔ خود کھاتا ہے وہ کچھ نہیں۔'' اُس دن سے بیچارے بچوں کو جو مفت کی آئس کریم کھانے کو ملتی تھی، وہ بند ہوگئی۔ جب بہت دنوں بعد شبانہ نے یہ واقعہ مجھے بتایا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

ریڈ فلیگ ہال ایک ایسے گلدستے کی طرح تھا جس میں مختلف قسم کے پھول ایک ساتھ سجے تھے پھر بھی ہر پھول کی اپنی ایک انفرادیت تھی، ایک الگ خوشبو تھی مثلاً گجرات سے آئے ہوئے منی بین اور امبو بھائی، مراٹھواڑہ سے ساونت اور ششی، یو پی سے کیفی، سلطانہ آپا، سردار بھائی، اُن کی دو بہنیں رباب اور ستارہ، مدھیہ پردیش سے سدھیر جوشی، شوبھا بھابی اور حیدرآباد سے میں۔ ریڈ فلیگ میں سب ایک ایک کمرے کے گھر میں رہتے تھے۔ سب کا باورچی خانہ بالکنی میں ہوتا

تھا۔ وہاں صرف ایک باتھ روم تھا اور ایک ہی لیٹرین لیکن نو سال کے عرصے میں میں نے کبھی کسی کو باتھ روم اور لیٹرین کے لیے لڑتے نہیں دیکھا۔ ہولی، دیوالی اورعید سب مل کر مناتے۔ سب کے ایک ایک دو دو بچے تھے۔ کھیل کھیل میں شاید بچوں کی لڑائی ہو جاتی ہوگی لیکن کسی بچے کی ماں آ کر کسی دوسرے بچے کی ماں سے نہیں لڑتی تھی اور نہ ہی شکایت کرتی تھی۔ سلطانہ آپا سب بچوں کی اماں کہلاتی تھیں اور سردار جعفری سب کے دودا۔ میں سب کی ممی اور کیفی سب کے ابا۔ شوبھا بھابی سب بچوں کی بھابی تھیں۔

میرے بچے بڑے ہورہے تھے۔ اسکول جانے لگے تھے اس لیے میں اُنھیں پرتھوی تھیٹر کے ٹور پر نہیں لے جا سکتی تھی۔ ایلس اور کیفی کے سہارے اُنھیں گھر پر چھوڑ کر جانا پڑتا تھا لیکن مجھے کبھی اِس بات کی پریشانی نہیں ہوئی کہ میرے بچے میری غیر حاضری کو شدت سے محسوس کریں گے یا کسی complex میں مبتلا ہوں گے۔ وہ ویسے ہی خوش و خرم رہتے۔ ریڈ فلیگ ہال کے سارے بچے مل جل کر کھیلتے۔ دکھ اور بیماری میں مائیں ہر بچے کا خیال رکھتیں۔ سب مرد پارٹی ممبر تھے۔ عورتوں میں سوائے سلطانہ آپا کے کوئی عورت پارٹی ممبر نہیں تھی۔ سب کے مذاہب مختلف تھے لیکن سب کا نظریۂ حیات ایک تھا یعنی انسانیت۔

کیفی کی فلمیں

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ کیفی کو گرودت کی فلم 'کاغذ کے پھول' کے گانے لکھنے کے لیے بلایا گیا۔اب کیا تھا، بڑے بڑے ڈائرکٹر کیفی کو بلا کے اپنی فلموں

کے گانے لکھوانے لگے جیسے کہ موہن سہگل کی 'اپنا ہاتھ جگن ناتھ'، رمیش سہگل کی 'شعلہ اور شبنم' اور ایک فلم تھی 'ایک کے بعد ایک'۔ بدقسمتی سے تمام فلمیں فلاپ ہوگئیں لیکن اُن کے گانے بہت مشہور ہوئے۔ اِن فلموں کے فلاپ ہونے کی وجہ سے کیفی کو اَن لکی سمجھا جانے لگا جس کی وجہ سے اُنھیں فلمیں ملنی بند ہوگئیں۔

اس کے کئی برسوں بعد جب ہم ریڈ فلیگ ہال سے جُو ہُو جانکی کُٹیر آچکے تھے، ایک شام آٹھ بجے چیتن آنند ہمارے گھر آگئے۔ اُس وقت تک کیفی کی کئی پکچرس ریلیز ہو کر فلاپ ہوچکی تھیں۔ کیفی تھوڑے مایوس تھے لیکن چیتن صاحب نے کہا :''کیفی صاحب میں بھی فلاپ فلمیں بناتے بناتے تنگ آگیا ہوں۔ دو مائی نس (minus) مل کر ایک پلس (plus) ہوجاتے ہیں، میری فلم کے گانے آپ لکھیں گے۔ پکچر کا نام 'حقیقت' ہے۔'' کیفی خوش ہو گئے۔ یہ پکچر زبردست ہٹ ہوئی۔ اس فلم کے گانے آج تک ہٹ ہیں :

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو
اب تمھارے حوالے وطن ساتھیو

پھر تو چیتن آنند، مدن موہن اور کیفی اعظمی کا گروپ بن گیا۔ چیتن آنند کی ہر فلم کیفی ہی لکھتے تھے۔ اُن کے ساتھ 'ہیر رانجھا' کیفی نے پوری فلم شاعری میں لکھی۔ آئیڈیا چیتن آنند کا ہی تھا۔ یہ فلم بھی ہٹ ہوئی اور کیفی صاحب کا بہت نام ہوا۔

مدراس کی ایک فلم مل گئی (مجھے نام یادنہیں) کیفی نے قسطوں پر ایمبسڈر گاڑی خریدلی۔ ایک دن گاڑی میں کیفی آگے بیٹھے ہوئے تھے اور میں اپنی دوست رضیہ کے ساتھ پیچھے۔ کیفی مڑ کر میری طرف خوشی سے کہنے لگے:'' اب تو تم گاڑی

والی ہوگئیں۔''

میں بھی کچھ اِترانے لگی۔

کیفی کی کامیاب ترین فلموں میں 'گرم ہوا' قابلِ ذکر ہے۔اِس فلم کی بے حد تعریف ہوئی۔ کیفی کو نیشنل ایوارڈ ملا اور فلم فیئر کے تین ایوارڈ کہانی، ڈائیلاگ رائٹنگ،اور اسکرین پلے کے لیے۔

O

میرے ڈرامے

پرتھوی تھیئٹر

میں نے پرتھوی تھیئٹر 1951 میں جوائن کیا تھا۔ایک دن زہرہ سہگل، جو اپٹا میں بھی کام کرتی تھیں، اُنھوں نے مجھے پرتھوی تھیئٹر کا ڈرامہ 'پٹھان' دکھایا۔ 'پٹھان' دیکھنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بھی پرتھوی تھیٹر میں کام کروں گی۔ میں نے زہرہ جی سے کہا ''میں پرتھوی راج جی سے ملنا چاہتی ہوں اور اُن کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔'' زہرہ جی نے پاپا جی (پرتھوی راج جی کو سب پاپا جی کہتے تھے) سے کہا۔ مجھے بلایا گیا۔ میں پرتھوی تھیٹر پہنچی۔ جیسے ہی پاپا جی نے مجھے دیکھا، سیدھے میری طرف چلے آئے۔ اُن کی شخصیت سے میں اس قدر مرعوب ہوئی کہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور آداب کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے: ''آپ پر ایک آنہ جرمانہ ہوگا۔'' میں نے پوچھا ''کیوں؟'' بولے '' میرے آنے پر جو بھی کھڑا ہوتا ہے اُس کی یہی سزا ہوتی ہے۔'' میں ہنس پڑی اور جلدی سے بیٹھ گئی۔ مجھے اُن سے مل کر ایک طرح کی اپنائیت کا احساس ہوا۔ وہ میرے آنے سے خوش ہوئے

تھے لیکن کہنے لگے :''میرا ورکر فنڈ، جس سے میرے تھیئٹر میں کام کرنے والوں کو بوقت ضرورت قرض دیا جاتا ہے، میرے تھیئٹر سے زیادہ امیر ہے۔ میں آپ کو کوئی زیادہ تنخواہ تو نہیں دے سکوں گا لیکن آپ میرے ساتھ کام کر سکتی ہیں۔''

دوسرے دن سے میں نے صبح نو بجے اوپیرا ہاؤس تھیئٹر جانا شروع کر دیا۔ اسٹیج پر کبھی ناٹیہ شاستر پڑھا جاتا جسے ہندی کے اسکالر شری رام شاستری پڑھتے تھے۔ وہ ایک اچھے ایکٹر بھی تھے۔ کبھی آواز کی تیاری ہوتی مثلاً ہارمونیم پر پاپا جی سُروں کی مدد سے آواز کو ٹرین کرتے۔ نیچے کی آواز کے لیے وہ گاتے اللہ ہُو اللہ ہُو، اوپر کے سُروں کے لیے رام رام کا آلاپ کرتے۔ اُن دنوں میں چار مہینے کی شبانہ کو کمر پر لاد کر ساتھ لے جاتی تھی۔ ریہرسل کے دوران اسٹیج کے ایک کونے میں چھوٹا سا گدا بچھا کر اُسے لٹا دیتی جہاں وہ ہاتھ پاؤں مارتی اور غوں غاں کرتی رہتی تھی۔ رانی آزاد (جو تھیئٹر میں کام کرتی تھی) اُس سے چپکے چپکے کھیلتی رہتی۔ میں شبانہ کے کپڑے میک اپ روم میں سُکھانے کے لیے لٹکا دیتی لیکن پاپا جی کبھی اعتراض نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے مجھے گھر کا سا ماحول محسوس ہوتا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد، خوش قسمتی سے مجھے ایلس جیسی ذمے دار آیا مل گئی تو میں اکثر شبانہ کو گھر پر اُس کے ساتھ ہی چھوڑ دیتی تھی۔

شو ہمیشہ اتوار کی صبح ہوتے تھے۔ شو شروع ہونے سے پہلے اسٹیج کے پیچھے کچھ اور ہی طرح کا سماں ہوتا تھا۔ ایک پُراسرار سا اندھیرا، شہنائی کی مدھر آواز، اگر بتی کی خوشبو وغیرہ سے مندر کا سا مقدس ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں شہنائی بجاتے لوگ دیو مالائی کردار لگتے۔ میک اپ روم سے آتی ہوئی ہلکی سی روشنی میں لڑکیوں کی سرگوشیاں، دھیمی دھیمی ہنسی کی آوازیں اِس اندھیرے کو اور بھی پُراسرار بنا

دیتی تھیں۔ شو شروع ہونے سے پہلے سارے آرٹسٹ اسٹیج پر جمع ہو جاتے اور ایک ساتھ ایک آواز میں سنسکرت کا اشلوک پڑھتے جو تھیئٹر کی تعریف میں ہوتا جس سے تھیئٹر کی عظمت کا احساس دل پر شدت سے طاری ہو جاتا تھا۔ پردہ اُٹھتے ہی ڈرامے کا جادو بھرا ماحول آرٹسٹ کو اپنی لپیٹ میں اس طرح لے لیتا جیسے وہ اُسی ماحول کا حصہ ہو۔ اگر ڈرامہ 'پٹھان' پیش کیا جارہا ہوتا تو ایسا لگتا کہ ہم پشاور کی کسی گڑھی میں پہنچ گئے ہیں۔

(آہستہ آہستہ پو پھٹ رہی ہے۔ اذان کی آواز، جگنوؤں کا اِدھر اُدھر چمک جانا۔ چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی گھڑا بغل میں دبائے، پشتو میں دھیمے سُروں میں گنگناتی ہوئی، ہنستی مسکراتی گزر رہی ہے۔ دوسری طرف سے ایک نو عمر لڑکا، سر پر گول ٹوپی پہنے، لڑکی کو مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوا گڑھی پر چڑھنے لگتا ہے۔ جرگے کا سردار (پرتھوی راج کپور) بڑے سے پھاٹک کو کھولتے ہوئے، پیر سے اُسے ٹھوکتا ہوا ہدایت کرتا ہے کہ کل بڑھئی کو بلا کر اسے ٹھیک کراؤ۔)

میں نے جب بھی آڈیئنس میں بیٹھ کر پرتھوی راج کپور کا ڈرامہ دیکھا تو ہمیشہ مجھے لگا کہ میں سچ مچ اُس ماحول میں پہنچ گئی ہوں جو سامنے اسٹیج پر پیش کیا جارہا ہے، چاہے وہ 'غدار' کا مسلم ماحول ہو یا 'آہوتی' کا پنجابی ماحول یا 'کلا کار' کا پہاڑی ماحول۔ پرتھوی راج کپور اُسے اِس طرح پیش کرتے تھے گویا آپ وہیں کہیں بیٹھے ہوں۔ یہ سارا سماں ایک عجیب وغریب کشش سے آپ کو اپنے ماحول میں کھینچ لیتا اور آپ اُس وقت تک محو ہو کر اُسے دیکھتے رہتے جب تک شو ختم نہیں ہو جاتا اور آپ اپنی دنیا میں واپس نہیں آجاتے۔

پرتھوی راج جی کا گٹ اپ سر سے پیر تک وہی ہوتا تھا جو کردار وہ پیش کر

رہے ہوتے تھے۔ بولنے کا انداز۔ چال ڈھال وغیرہ۔ وہ Stanislavsky کے method پر عمل کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے "جب تم کوئی کردار پیش کرو تو اُس میں اِس طرح سما جاؤ کہ کوئی تمھارا دل چیر کر بھی دیکھے تو اُس کو اُسی طرح دھڑکتا ہوا پائے جس طرح اُس کردار کا دل دھڑکتا ہو۔" تھیئٹر کی عظمت، اُس کی عزت، شان و شوکت اگر میرے دل میں پیدا ہوئی ہے تو وہ پرتھوی راج کپور کے تھیئٹر نے پیدا کی۔

پاپا جی اپنے بچپن کے قصے سنایا کرتے۔ ایک بار کہنے لگے " میں اپنے تھیئٹر کو پارسی تھیئٹر کے اثر سے بچا کر لایا ہوں۔ میں شاید چھ سال کا تھا۔ اپنے پتا جی کے ساتھ پشاور میں تھیئٹر دیکھنے گیا۔ 'نل دمنتی' ڈرامہ چل رہا تھا۔ ایک سین میں ماں نے مرے ہوئے چھوٹے سے بچے کو زمین سے اُٹھا کر گود میں لیا اور درد بھری آواز میں ایک گانا گانے لگی۔ گانا ختم ہوتے ہی آڈیئنس کی آوازیں گونجیں، 'once more, once more' عورت نے پھر بچے کو نیچے رکھا۔ پھر گود میں لیا اور پھر وہی گانا گا دیا۔ میرے ننھے سے دل نے کہا یہ غلط ہے۔ اُسے دوبارہ نہیں گانا چاہیے۔"

شاید اُسی بات کا اثر ہوگا جس کے سبب پرتھوی تھیئٹر وجود میں آیا۔

پرتھوی تھیئٹر کے ڈرامے

پاپا جی کے ڈرامے ہمیشہ سوشل تھیم پر ہوتے تھے۔ ڈرامے کے کاسٹیوم عذرا جی تیار کرتی تھیں (عذرا جی زہرہ جی کی چھوٹی بہن ہیں۔ وہ پرتھوی تھیئٹر کے

ڈراموں میں ہیروئن کا رول کرتی تھیں۔) اُن کا مذاق (taste) بہت اچھا ہے۔ پارسی تھیئٹر کا ایک تجربہ کار سیٹ ڈیزائنر اور اُس کا بیٹا سیٹ بناتے تھے لیکن سجاوٹ اور فرنیچر سب عذرا جی کے مذاق کے مطابق ہوتا تھا۔ ڈانس کی تعلیم زہرہ جی دیتی تھیں۔ڈانس کمپوز بھی وہی کرتی تھیں۔ زہرہ جی نے اودے شنکر کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہاں ڈانس بھی سکھاتی تھیں۔وہ بہت اچھی کیریکٹر آرٹسٹ تھیں بلکہ ہیں۔ مجھے تھیئٹر کی جو تھوڑی بہت سُوجھ بُوجھ ہے وہ پرتھوی راج کپور کے بعد زہرہ سہگل ہی کی دین ہے۔

پندرہ بیس سال کے عرصے میں پرتھوی راج جی نے آٹھ ڈرامے 'شکنتلا' 'دیوار' پٹھان' ' غدار' ' آہوتی ' کلاکار' 'پیسہ اور' کسان' ' پیش کیے۔ یہ تمام ڈرامے سماج میں ہونے والی برائیوں کے خلاف تھے۔

'شکنتلا' تو کلاسک ہونے کی وجہ سے لیا گیا۔'دیوار' ہندستان کے بٹوارے کے خلاف تھا۔'پٹھان' ہندو مسلم اتحاد کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔ اتحاد کے موضوع پر ہندو مسلم دوستی کی اِس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں ملے۔

'آہوتی ' بھی بہت پُر اثر ڈرامہ تھا۔ اس میں بٹوارے کے دردناک نتائج کی کہانی تھی۔نفرت کے اُس دور میں، عام ہندو اور مسلمان دونوں کیسے کیسے ہولناک حالات سے گزرے،یہ'آہوتی ' میں دکھایا گیا تھا۔

'غدار' بھی ہندوستان اور پاکستان کے موضوع پر تھا۔ جب ہم ساؤتھ انڈیا کے ٹور پر کوچین پہنچے تو کچھ مسلم لیگیوں نے'غدار' کی مخالفت کی اور کہا ''اگر یہ ڈرامہ کھیلا گیا تو ہم تھیئٹر کو آگ لگا دیں گے۔'' پرتھوی راج جی نے اُنھیں بلایا اور کہا ''آپ آیئے اور ڈرامہ دیکھیے۔اگر ڈرامہ آپ کو غلط لگے تو بے شک آپ کا

جو جی چاہے وہ کیجیے۔'' چنانچہ وہ لوگ ڈرامہ دیکھنے آئے اور ڈرامہ دیکھنے کے بعد اُنھیں لوگوں نے جو تھیئٹر جلانے کی دھمکیاں دے رہے تھے، اسٹیج پر آکر، پرتھوی راج جی کو گلے لگایا اور مبارک باد دی۔'غدار' میں یہ دکھایا گیا تھا کہ عام آدمی کی حالت جو ہندوستان میں ہے وہی پاکستان میں بھی ہے۔

آج ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کے لیے کوشش کی جارہی ہے جو بڑی حد تک کامیاب بھی ہو رہی ہے۔ شاید پرتھوی راج جی اِس دوستی کی اہمیت کو برسوں پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔

'کلاکار' میں اِس بات کو اُجاگر کیا گیا تھا کہ دیہات کی معصومیت اور بھولپن شہر میں آکر کس طرح تباہ ہوتے ہیں۔ یہ واقعی دل کو چھو لینے والا ڈرامہ تھا۔

'کسان' کا تھیم تھا کہ اتنی محنت و مشقت کرنے کے باوجود کسان کتنی تکلیفیں جھیلتا ہے۔

'پیسہ' یہ بتاتا تھا کہ دولت کی لالچ انسان میں کیسی تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ کوئی بھی ڈرامہ ایسا نہیں تھا جس میں صرف تفریح کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ ہر ڈرامے میں تفریح کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی سبق بھی تھا۔ افسوس کے اُس وقت کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ اُن ڈراموں کو ریکارڈ کر لیا جائے تاکہ یہ ڈرامے آنے والی نسلوں تک بھی پہنچ سکیں۔ ویسے بھی اُس وقت ویڈیو کا وجود ہی نہیں تھا اور نہ تو کسی کو اُن ڈراموں کی اہمیت کا اتنا احساس تھا کہ اُنھیں فلم کی طرح شُوٹ کر لیا جاتا۔

ہم لوگوں میں یہ کمزوری ہے کہ اپنے آرٹ کو document کرنا نہیں جانتے۔شاید اِسی لیے یہ قابلِ فخر ڈرامے ہمیشہ کے لیے محفوظ نہیں ہو سکے۔ افسوس !

پاپا جی

پرتھوی راج جی اپنے آرٹسٹوں کے ساتھ ایک باپ یا بڑے بھائی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ بہت ہی حساس، خوددار اور محبت والے انسان تھے۔ جب وہ چار سال کے تھے تو اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اُن کے دادا نے اُن کو پالا تھا لیکن وہ ماں کی محبت کے لیے ترستے تھے۔ کہتے تھے:" جب میں چھوٹا سا تھا تو اپنی عمر کے ایک لڑکے کے ساتھ جو میرا دوست بھی تھا، اسکول چھوٹنے کے بعد بجائے اپنے گھر جانے کے، اُس کے گھر جاتا تھا اور دروازے میں کھڑا یہ دیکھا کرتا تھا کہ اُس کی ماں کس طرح اپنے بچے کا سواگت کرتی ہے۔ کیسے پیار سے اُس کا بستہ لیتی ہے، لپٹا کر پیار کرتی ہے، کھانے کو دیتی ہے۔"

میں اب بھی پرتھوی راج جی کی بات سوچتی ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ شاید یہی کمی تھی جس نے اُس بچے کو اتنا بڑا آدمی بنایا،ایک ایسا حساس انسان بنایا جس کے دل میں سارے ہندوستان کے لیے محبت تھی۔ پرتھوی راج جی کی خواہش تھی کہ وہ اپنے ڈرامے ہندستان کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں جا کر دکھائیں۔

تین گھنٹوں کے شو کے بعد پرتھوی راج جی دروازے پر ایک جھولی لے کر گردن نیچی کیے کھڑے ہوجاتے تھے تاکہ لوگ باہر نکلتے وقت جھولی میں جتنے پیسے ڈالنا چاہیں ڈال دیں۔ جو کچھ ملتا وہ منیجروں کے حوالے کر کے میک روپ روم میں چلے جاتے۔ یہ پیسہ تھیئٹر کے ورکر فنڈ میں جمع ہوتا اور ضرورت مند آرٹسٹوں کو اُدھار دیا جاتا تھا۔ پھر اُن کی تنخواہ سے اُن کی مرضی کے مطابق کاٹا جاتا تھا۔ اِس

فنڈ سے میں نے کئی بار فائدہ اُٹھایا۔ جب میرا بیٹا بابا اعظمی آٹھ مہینے کی عمر میں بیمار ہوا تو میں نے اسی فنڈ سے قرض لے کر اُس کا علاج کروایا تھا۔ اُس وقت میری تنخواہ سو روپے تھی اور میں اپنے دونوں بچوں کو اُن کی آیا ایلس کے ساتھ ٹور پر لے جایا کرتی تھی۔ تھیئٹر صرف ٹور پر ہی پیسے کماتا تھا ورنہ بمبئی میں تو وہ نقصان میں ہی چلتا تھا۔ اتوار کی صبح نو بجے لوگ ڈرامہ دیکھنے کم ہی آتے تھے۔

میں نے سارا ہندستان پرتھوی تھیئٹر کی بدولت ہی دیکھا تھا۔ کبھی کبھی ایک شہر سے دوسرے شہر کو ہم بس سے جاتے تھے۔ راستے میں رک کر کبھی چائے کے لیے بس رکتی تو پرتھوی راج جی اپنے آرٹسٹوں سے مخاطب ہو کر کہتے: "دیکھو بچو! یہ وقت ہے مختلف لوگوں کے کیرکٹر کی اسٹڈی کرنے کا۔ وہ دیکھو وہ بوڑھی عورت کس طرح بیٹھی ہے۔ اُس کے کپڑے کیسے ہیں۔ اُس کے چہرے پر جھریاں کہاں کہاں ہیں۔ یہ کس طبقے کی عورت ہے۔ غور سے دیکھو۔ جب کسی ڈرامے میں تم کو یہ کیریکٹر کرنے کا موقع ملے گا تو تمھارا یہ observation کام آئے گا۔"

اُنھیں آثارِ قدیمہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی ہم ایسے کسی شہر میں جاتے جہاں ایسے پرانے کھنڈرات ہوتے تو وہ اپنے آرٹسٹوں کو لے کر وہاں ضرور جاتے اور ایک ایک پتھر تک کو بڑے غور سے دیکھتے۔ پٹنہ کے تمام آثارِ قدیمہ میں نے اُن کے ساتھ دیکھے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

وہ بے انتہا رحم دل تھے۔ ایک مرتبہ کلکتے میں، ایک ورکر جس کا نام ڈھونڈو تھا، اُسے ہیضہ ہو گیا۔ پرتھوی راج جی کسی میٹنگ میں باہر گئے ہوئے تھے۔ دن کے ڈیڑھ بجے تھے۔ اُس کی اُلٹیوں اور فُضلے سے کمرہ بے حد گندہ ہو گیا تھا۔ ہم لڑکیاں تو مارے ڈر کے اُس کے کمرے کے آس پاس بھی نہیں جا رہی تھیں۔ جب

پرتھوی جی باہر سے آئے تو کسی نے کہہ دیا کہ ڈھونڈو کو کالرا ہو گیا ہے۔ بس پاپا جی بغیر جوتے اُتارے اُس کے کمرے کی طرف بھاگے اور جا کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ڈھونڈو کا جسم ٹھنڈا ہوتا جارہا تھا مگر پاپا جی اُسے ڈاکٹر کے آنے تک اس طرح لپٹائے رہے کہ اس کو جسم کی کچھ حرارت ملتی رہے۔ جب ڈاکٹر آیا تو اُس نے کہا "پرتھوی راج جی، اِس شخص کی جان صرف آپ نے اپنے جسم کی گرمی دے کر بچائی ہے ورنہ یہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔"

میں کتنے ہی دن حیرت اور تعجب سے سوچتی رہی کہ اُنھوں نے وہاں کی گندگی کا بھی خیال نہیں کیا اور نہ ہی یہ سوچا کہ یہ بیماری اُنھیں لگ جائے گی۔ میرے دل میں اُن کے لیے عزت اور بڑھ گئی۔

کبھی اُن کا کھانا الگ نہیں پکتا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد دو بجے رات کو نہا دھو کر وہ اور عذرا جی زمین پر، جہاں ہم سب آرٹسٹ کھانا کھاتے تھے، آ کر بیٹھ جاتے اور وہی کھانا کھاتے۔ کھانے کا منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑی سی دری زمین پر بچھی ہوتی۔ بڑے بڑے دیگوں میں کھانا پکتا تھا۔ پتھر کے چولہے یا بڑی بڑی انگیٹھیاں۔ ایک طرف میز پر اسٹیل کے برتن جن میں تھالیاں کٹوریاں چمچے وغیرہ ہوتے تھے۔ ہر آرٹسٹ میز پر سے ایک تھالی، دو کٹوریاں اور دو ایک چمچے لے کر باورچی کے پاس جاتا۔ کھانا دینے والا دوسرا آدمی پتیلیوں کے پاس بیٹھا ہوتا۔ آپ کو جتنا کھانا چاہیے تھالی اور کٹوریوں میں پروس دیا جاتا۔ روٹی گرم گرم کھائی جاتی۔ روٹی کے لیے عجیب عجیب آوازیں آرٹسٹوں کی آتیں: "ارے رام سنگھ (روٹی پکانے والا) میری روٹی ذرا کڑک سیکنا۔ میری روٹی ذرا پھولی ہوئی ہو۔"

جو لڑکا بھاگ بھاگ کر روٹی لاتا اُسے ڈانٹ بھی پڑتی: ''بیوقوف! یہ روٹی ہے یا توا۔۔۔ لیجاؤ، دوسری لاؤ۔''

پاپا جی مسکراتے ہوئے سنتے اور کچھ بھی نہ کہتے۔

کئی بار تو یوں بھی ہوتا کہ ہمارے آرٹسٹ رکشا میں شاپنگ کے لیے جاتے اور رکشہ والے کو پیسے دینے کی بجائے اپنے ساتھ بٹھا کر دوپہر کا کھانا کھلا دیتے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ یہ کون ہے اور انھیں کھانا کیوں دیا جارہا ہے۔ پرتھوی تھیٹر کے دسترخوان پر سب کے لیے جگہ نکل آتی تھی۔

ایک مرتبہ عجیب واقعہ ہوا۔ شبانہ تین سال کی تھی۔ ہم لوگ بنارس میں بدھ کا مندر دیکھنے گئے تھے۔ شبانہ میرے ساتھ تھی اور بابا جو دو مہینے کا تھا، ایلس لیے تھی۔ ہم جب سارے آثارِ قدیمہ دیکھ چکے تو بسوں میں بیٹھ کر چل پڑے۔ ہم کوئی دس میل گئے ہوں گے تو پرتھوی راج نے پوچھا کہ شبانہ کہاں ہے؟ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو دکھائی نہیں دی۔ میں بھاگ کر ایلس کے پاس گئی جو آگے کی سیٹ پر بیٹھی تھی، پوچھا تو وہ بولی ''مُنی بے بی تو آپ کے ساتھ تھی۔'' میرے پیروں تلے تو جیسے زمین نکل گئی۔ میں رونے لگی۔ پرتھوی راج جی نے فوراً آرڈر دیا کہ بس واپس لے چلو۔ دس میل پلٹ کر مندر پہنچے تو دیکھا میری بچی ایک بڑے سے درخت کے نیچے اکیلی کھڑی رو رہی تھی۔ مجھے اُس کا سہما ہوا چہرہ آج بھی یاد ہے۔

پرتھوی راج جی کی انسان دوستی اور رحم دلی کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک بار پورا تھیٹر تین بسوں میں کشمیر جا رہا تھا۔ پہاڑوں کے پُر پیچ راستے تھے۔ ایک جگہ بس رک گئی۔ پتہ چلا کہ جو مزدور وہاں راستہ بنانے کا کام کر رہے تھے اُن میں سے ایک بیلنس کھو بیٹھا اور چٹانوں سے گر کر زخمی ہوگیا ہے۔

پاپا جی تڑپ کر بس سے نیچے اترے۔ ہم لڑکیوں کو آرڈر ہوا کہ ایک سیٹ فوراً خالی کرو۔ دیکھا کہ پرتھوی راج جی اُس زخمی مزدور کو جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا، دو لڑکوں کی مدد سے اُٹھا کر لا رہے ہیں۔ اُس مزدور کو سیٹ پر لٹا دیا۔ ہمارے ساتھ ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر بھی رہتا تھا۔ اُس نے فوراً اُس مزدور کے سر کی مرہم پٹی کی اور کوئی دوا اُس کے منہ میں ڈالی، پھر بھی مزدور کو ہوش نہیں آیا۔ پاپا جی نے آرڈر دیا کہ بس کو واپس لے چلو اور جہاں کوئی ہاسپٹل ہو وہیں روک دینا۔ پرتھوی راج جی اُس مزدور کو ایک ہاسپٹل میں داخل کروا کے اور اُس کے ایک ساتھی کو اُس کے لیے کچھ پیسے دے کر ہی واپس لوٹے۔

جب بھی ہم کسی شہر میں جاتے تو ہمیشہ ہمارے منیجر ایسی جگہ ڈھونڈتے جہاں کم سے کم سو آدمی ٹھہر سکیں کیوں کہ ہم سب آرٹسٹ سو سے کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے۔ ہمارے بستر جو ہم اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے،زمین پر بچھائے جاتے تھے۔ پاپا جی کو ایک کمرہ ملتا جہاں اُن کا بستر زمین پر ہی لگایا جاتا تھا۔آرگنائزر گھبرائے ہوئے آتے اور کہتے :'' پاپا جی آپ زمین پر!حکم کیجیے، ہم ابھی آپ کے لیے تخت یا پلنگ کا انتظام کرتے ہیں۔''

مسکرا کر کہتے :''اگر آپ 99 پلنگوں کا انتظام کر سکتے ہوں تو سواں پلنگ میرے لیے بھی لے آئیں۔''

پرتھوی تھیٹر کے ڈراموں میں میرا original role کوئی نہیں تھا۔ understudy تو میں نے سارے رول کر لیے تھے۔ (تھیٹر میں انڈر اسٹڈی اُس اداکار کو کہتے ہیں جو ایک ایسا رول تیار کر کے رکھے جسے اسٹیج پر کوئی دوسرا اداکار کر رہا ہے اور ضرورت پڑنے پر اُس کی جگہ یہ رول کر سکے۔) لیکن میرا کوئی اپنا رول

نہ ہونے کی وجہ سے میری دل چسپی کم ہوتی گئی۔ 1957 میں پاپا جی نے فیصلہ کیا کہ ڈرامے 'پیسہ' کی فلم بنائیں گے تاکہ آرٹسٹوں کو زیادہ دن ٹور پر نہ رہنا پڑے۔ فیملی والے آرٹسٹ مسلسل ٹور پر رہنے کی وجہ سے گھبرا گئے تھے۔ فلم شروع ہوگئی۔ میں نے پرتھوی تھیئٹر کو الوداع کہہ دیا لیکن پرتھوی تھیئٹر کا ماحول، پرتھوی تھیئٹر کی یادیں، میرے دل کے ایک کونے میں ابھی تک محفوظ ہیں۔

ایلیک پدمسی کے ڈرامے

میں نے جب پرتھوی تھیئٹر چھوڑا اُسی زمانے میں تھیئٹر گروپ، جس کے ڈائریکٹر ایلیک پدمسی تھے (دراصل اُن کا نام تو علیق ہے لیکن دنیا اُنھیں ایلیک پدمسی کے نام سے جانتی ہے اور میں بھی اُنھیں یہی کہتی ہوں) انگلش ڈرامے کھیلا کرتا تھا۔ اِس گروپ کا بڑا نام تھا۔ ایک دن میری دوست تمو میرے پاس آئیں اور کہا ''تھیٹر گروپ والے ایک دن ایکٹ ڈرامہ کھیلنا چاہتے ہیں، ڈائریکٹر امین سیانی ہیں اور ڈرامے کا نام ہے 'نوکرانی کی تلاش'۔ دلچسپ ڈرامہ ہے۔ وہ تم کو مرکزی رول دینا چاہتے ہیں۔'' میں تیار ہوگئی۔ ڈرامے میں میرا رول ایلیک پدمسی کو بہت پسند آیا اور اُنھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہندی کے ایک فُل لینتھ ڈرامے میں مجھے لینا چاہتے ہیں۔ ٹینیسی ولیم کے انگلش ڈرامے 'Glass Menagerie' کا ہندی adaptation رفعت شمیم نے 'شیشوں کے کھلونے' کے نام سے کیا تھا۔ وہ ایلیک کے دوست بھی تھے۔ میں تیار ہو گئی۔ مجھے ایلیک کے ڈائریکشن میں کام کر کے بہت خوشی ہوئی۔ چونکہ وہ خود ایک بہت اچھے ایکٹر

بھی ہیں، اس لیے مجھے اپنے کیرکٹر کو کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ ڈرامہ کامیاب ہوا۔ ایلیک نے فوراً دوسرا ڈرامہ تیار کرنا شروع کیا۔ انگریزی ڈرامے 'All My Sons' کا ترجمہ 'سارا سنسار اپنا پریوار' کے نام سے رفعت شمیم نے ہی کیا تھا۔اُس میں بھی مجھے رول آفر کیا گیا تھا لیکن مجھے نوکری کی فکر تھی۔ پہلے پرتھوی تھئیٹر سے مجھے ڈھائی سو روپے ملتے تھے لیکن یہاں سے کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اتنے میں اخبار میں اشتہار آیا کہ آل انڈیا ریڈیو کو چار پانچ اناؤنسروں کی ضرورت ہے۔ سردار بھائی سے درخواست لکھوا کر بھیج دی۔فوراً جواب آگیا کہ انٹرویو کے لیے آجایئے۔ اُس وقت نریندر شرما وِودھ بھارتی شروع کر رہے تھے۔ اُنھوں نے تھئیٹر گروپ کا ڈرامہ دیکھا تھا۔ وہ میری صلاحیت سے واقف تھے۔ میں انٹرویو میں کامیاب ہوگئی اور مجھے آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر کی نوکری مل گئی۔ میری تنخواہ 175 روپے مقرر ہوئی کیونکہ میں ڈرامے میں بھی کام کرتی تھی، ورنہ اُس زمانے میں اناؤنسر کی تنخواہ صرف ڈیڑھ سو روپے تھی۔ میرے ساتھ سشما آنند اور دولڑکے لیے گئے تھے۔ وِودھ بھارتی کا پہلا پروگرام 'من چاہے گیت' میری آواز میں براڈکاسٹ ہوا تھا۔ شروع شروع میں گیت کار اور میوزک ڈائرکٹر کے نام اناؤنس نہیں کیے جاتے تھے۔میں نے ایک میٹنگ میں نریندر شرما اور اسٹیشن ڈائرکٹر ملک صاحب سے درخواست کی کہ جب ہم گانے پیش کریں تو رائٹر اور میوزک ڈائرکٹر کے نام بھی اناؤنس کیے جائیں۔ وہ مان گئے۔ تب سے ریڈیو پر گیت کار اور میوزک ڈائرکٹر کے نام بتائے جانے لگے۔ جس سے ساحر لدھیانوی بہت خوش ہوئے کیونکہ اُن دنوں ساحر فلموں میں زیادہ گانے لکھ رہے تھے۔

تریوینی رنگ منچ

ایک دن سجن میرے گھر آئے اور کہنے لگے ''میں نے ایک تھیئٹر گروپ شروع کیا ہے جس کا نام ہے 'تریوینی رنگ منچ '۔ اُس کا پہلا ڈرامہ میں نے لکھا ہے 'پگلی'۔ اُس میں چھ کیرکٹر ہیں۔ جن میں ایک لڑکی کا ہے اور یہی اِس کا مرکزی کردار ہے۔ اِس کو سوائے آپ کے اور کوئی نہیں نبھا سکتا۔ اِس ڈرامے کو آل مہاراشٹر ڈرامہ کامپٹیشن کے لیے تیار کرنا ہے۔'' میں نے پوچھا '' وقت کتنا ہے ؟'' کہنے لگے، ''بہت کم۔ اسکرپٹ تو آپ کو ایک مہینے پہلے مل جائے گی لیکن ریہرسل صرف سات دنوں کی ہوگی کیونکہ اِس میں سب فلم کے لوگ کام کر رہے ہیں اور اُن کے پاس ریہرسل کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔'' اِس ڈرامے میں ایک کردار فلم کے مشہور ایکٹر آغا نے بھی کیا تھا۔

'پگلی' میں میرا کردار انتہائی مشکل تھا۔ اُس کو نبھانے میں کیفی نے بھی میری بہت مدد کی۔ صبح چائے پیتے وقت وہ مجھے ڈرامے کے مکالمے یاد کرواتے تھے۔ رول بہت بڑا تھا اور مجھے پگلی بننا تھا۔ میں نے سارے گھر کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک دن میں تخت پر چڑھ گئی اور زور زور سے ڈائیلاگ بولنے لگی ''اُٹھو گرے وہ بم کے گولے۔۔لو اپنے ہتھیار ہتھوڑے۔۔''میرا باورچی جو کھانا پکا رہا تھا، سمجھا کہ میں سچ مچ پاگل ہوگئی ہوں اور سر پر پیر رکھ کر گھر سے بھاگا۔ میں ہنس پڑی۔ اُسے جا کر بلا لائی۔ سمجھایا ''بھائی یہ سب ڈرامے کی تیاری ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں۔'' اُس وقت شبانہ دس سال کی تھی۔ ایک دن وہ سمجھی کہ میری ماں سچ مچ پاگل ہوگئی ہے۔ وہ دوڑ کر کیفی کے کمرے میں گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی ''ابا، ممی پاگل

ہوگئی ہیں۔'' کیفی لکھنے میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے اپنا قلم بند کیا اور شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے جُوہُو بیچ پر گئے۔ بہت پیار سے سمجھاتے ہوئے بولے ''بیٹے، ممی پاگل نہیں ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ڈرامے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ڈرنے یا شرمندہ ہونے کی بجائے تمھیں تو فخر کرنا چاہیے کہ تمھاری ممی اپنے کام کو اتنا seriously لیتی ہیں۔ ہم سب کو تو اُن کی مدد کرنی چاہیے تا کہ اُنھیں best actress کا انعام ملے۔'' ڈرامہ ہوا... اور بہت کامیاب ہوا۔ مہاراشٹر اسٹیٹ ڈرامہ کامپٹیشن میں ڈرامے کو فرسٹ پرائز اور مجھے بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ ملا۔

اب میں اپٹا کے ڈراموں میں باقاعدہ کام کرنے لگی وہاں ہر شو کے پچاس روپے ملتے تھے۔ ایک دن میں اپٹا کے ساتھ ٹور پر جارہی تھی۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں نے کیفی سے مانگے۔ اُن بے چارے کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔ میں چڑھ گئی '' جب بھی میں باہر جاتی ہوں مجھے خالی ہاتھ ہی جانا پڑتا ہے۔ تمھارے پاس کبھی پیسے نہیں رہتے۔ میری چپل بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔'' غرض یہ کہ میں چڑ چڑ کرتی ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اسٹیشن پر کیفی مجھے چھوڑنے کے لیے آئے تھے، مجھ سے کہنے لگے: ''اپنی چپل دو، ابھی ٹکوا کر لے آتا ہوں۔''

میں نے دے دی۔ میری چپل اپنی سفید ڈھیلی آستین میں چھپا کر لے گئے اور تھوڑی دیر میں اُسی طرح اپنی آستین میں چھپا کر لے آئے۔ مجھے اُن پر پیار آ گیا۔ میں نے کہا '' sorry جو میں نے چڑ چڑ کی۔'' اُنھوں نے چپکے سے پچاس روپے بھی نکال کر دیے۔ میں خوشی سے ہنس پڑی۔ :''ارے واہ، یہ تو اور بھی اچھی بات ہوئی۔ کہاں سے لائے ؟'' کیفی نے کہا، '' اب یہ نہ پوچھو۔ گاڑی چلنے والی ہے۔'' چپل پہن کے میں نے اُن کے ہاتھ کو پیار کر لیا اور گاڑی چل پڑی۔

شو کے بعد جب سجن سے میں نے اپنے پچاس روپے مانگے تو اُنھوں نے کہا: ''آپ کے پیسے تو کیفی صاحب لے گئے۔'' میں ہنس پڑی، تھوڑا غصہ بھی آیا، پھر سوچا، بیچارے کیفی کو اپنے پروڈیوسر سے پیسے نہیں ملے ہوں گے آخر کیا کرتے۔زندگی اِسی طرح چلتی رہی۔ اِپٹا کو چونکہ میں نے پھر سے جوائن کر لیا تھا اِس لیے تریوینی رنگ منچ کو زیادہ وقت نہیں دے پا رہی تھی۔ پھر کچھ وجوہات کی بنا پر سجن نے تریوینی رنگ منچ بند کر دیا۔

اِپٹا اور سنجیو کمار

جیسے جیسے کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری بدلتے گئے، پارٹی کی پالیسی بھی بدلتی گئی۔ 1950 میں ہنگل صاحب پاکستا ن سے ہندستان آگئے تھے۔ ہنگل صاحب اور آر .ایم .سنگھ صاحب دونوں ہی پارٹی ممبر تھے، اُنہوں نے مل کر اِپٹا کو سنبھال لیا۔دو ڈرامے کیے۔یہ دونوں ہی ڈرامے ہٹ ہوئے۔ 1957 میں ہنگل صاحب نے 'ڈمرو' نام کا ایک ڈرامہ ڈائرکٹ کیا۔ اُن دنوں ایک نوجوان لڑکا جس کا نام ہری ہر جری والا تھا۔ بہت پابندی سے اِپٹا آیا کرتا تھا۔ بائیس تئیس سال کی عمر رہی ہوگی۔ڈراموں سے بے حد دل چسپی تھی۔ اُس کا پابندی سے آنا ہنگل صاحب کو بھا گیا۔ اُنھوں نے 'ڈمرو' نام کے ایک ڈرامے میں ہری ہر جری والا کو مرکزی رول کے لیے چن لیا۔ اِس کیریکٹر کی عمر ساٹھ سال کی تھی، جو بینک میں ملازم تھا۔ اُس کی بیوی کا رول مجھے دیا گیا۔ اُس وقت تک میں ایک مشہور ایکٹریس ہو چکی تھی۔ میں ایلیک پدمسی کے ڈراموں میں بھی کام کرتی تھی اور اِپٹا میں بھی۔

میں نے اُس لڑکے کو دیکھا اور ہنگل صاحب سے کہا ''آپ نے اتنے اہم رول کے لیے اتنے young اور نا تجربہ کار لڑکے کو لے لیا ؟ کیا وہ یہ رول نبھا سکے گا ؟''
ہنگل صاحب نے کہا ''شوکت جی، یہ لڑکا بہت ہی پابندی سے آیا کرتا ہے۔ ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔'' میرے کیرکٹر کی عمر پچاس سال تھی۔ ایک عورت جو زیادہ بچوں کی وجہ سے سٹھیا سی گئی تھی۔ جب ریہرسل شروع ہوئی تو میں حیران رہ گئی۔ اتنی بڑی عمر کے آدمی کا رول وہ لڑکا کس خوبی سے ادا کر رہا تھا۔ جب ڈرامہ اسٹیج ہوا تو لوگ مجھے بھول گئے، سب ہری ہر جری والا کے مکالمے دوہراتے رہتے۔ اُن کا ایک مکالمہ تھا ''محنت کرو بھائی محنت، تبھی آگے بڑھو گے، تبھی ترقی ہوگی، آدمی بن جاؤ گے آدمی۔'' اُس کا میک اپ اور مینر اِزم mannerism اِس قدر صحیح تھا کہ میں حیران رہ گئی۔ وہ کہیں سے بھی تیس سال کا نوجوان نہیں لگتا تھا۔ پھر تو سبھی رائٹر ڈائرکٹر اِس لڑکے کے دیوانے ہو گئے۔ ہر ڈرامے میں اُسی کو کاسٹ کیا جاتا۔ وشوامتر عادل جو ہمارے جنرل سیکریٹری اور اسکرپٹ رائٹر بھی تھے، اُس کی اِس صلاحیت سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ اُسے فلموں میں لے گئے۔ ہر ڈائرکٹر سے اُسے متعارف کروایا۔ بی کلاس کی فلموں سے اُس نے اپنے فلمی کیرئیر کا آغاز کیا اور بڑے بینر کی فلموں تک پہنچ گیا۔ دنیا اُس ہری ہر جری والا کو سنجیو کمار کے نام سے جانتی ہے۔ اُسے صفِ اول کا اداکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ بہت کم عمری میں ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔

اِپٹا میں میرے رول

وشوامتر عادل، ہمارے بہت اچھے دوست تھے۔ میری چھوٹی آپا جان کی نند ذکیہ کے شوہر تھے۔ اِپٹا کے پریزیڈنٹ بھی تھے اور فلموں میں اسکرپٹ لکھتے تھے۔ اُنھوں نے ڈُلو یلانی کے انگریزی پلے 'No other way' کا انتہائی خوبصورت ترجمہ ''افریقہ جوان پریشان' کے نام سے کیا تھا۔ ڈرامہ افریقہ کے بیک گراؤنڈ میں انگریزوں کے خلاف تھا۔ عادل نے مجھ سے کہا،'' وہ ڈرامہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ ماں کا رول بہت زبردست ہے۔ آر.ایم.سنگھ صاحب ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔'' یہ نام سن کر میں خوش ہوگئی۔ وہ بہت اچھے ڈائرکٹر تھے۔ بڑے زور شور سے ریہرسل شروع ہوگئی۔ مجھے اپنا رول بے حد پسند آیا اور میں نے جی جان سے محنت شروع کردی۔ میں خواجہ احمد عباس سے مانگ کے اپنی ریسرچ کے لیے افریقہ پر کتابیں لے آئی۔ ایک تصویر میں کنویں کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت نظر آئی۔ چہرہ بارعب لیکن دردمند۔ میں اپنے منہ پر کالا میک اپ لگا کر آئینے کے سامنے جا کر ٹھیک اُسی کے پوز میں بیٹھ گئی۔ پورا کیرکٹر میرے سامنے جی اُٹھا۔ جب میں اُٹھی تو چال میری نہیں، اُس کیرکٹر کی تھی۔ جب میں نے اپنے ڈائلاگ بولے تو آواز میری نہیں اُس کیرکٹر کی بھاری بھرکم آواز تھی۔ میں نے پوری طرح اپنے آپ کو اس کیرکٹر میں ڈھال لیا۔ ایک رول کو زندہ کرنے میں اُتنی ہی محنت لگتی ہے جتنی ایک بچے کو جنم دینے میں۔ پہلے شو کے بعد کچھ لوگ میرے میک اپ روم میں گھس آئے اور کہنے لگے:'' کیا آپ افریقہ سے آئی ہیں۔ آپ کی چال ڈھال، آواز بالکل افریقی لگتی ہے۔'' 'بلٹز' میں

انورعظیم نے ایک پوراصفحہ میری تعریف میں لکھا۔'افریقہ جوان پریشان' سے مجھے بے حد شہرت ملی۔ اِس ڈرامے میں ہنگل صاحب میرے سسر کا رول کررہے تھے۔

اِس کے بعد اِپٹا کے تمام مرکزی رول مجھے اور ہنگل صاحب کو ہی ملتے۔

'تنہائی' ساگر سرحدی کالکھاہواڈرامہ تھا۔ مجھے اِس میں ایک ریٹائرڈ ایکٹرس کا رول ملا جو مرکزی کردار تھا۔ڈرامے کو رمیش تلوار نے ڈائرکٹ کیا اور وہ بہت کامیاب رہا۔

'آخری سوال' میں میں نے ڈاکٹر مُکتا کا رول کیا،جس کی جوان بیٹی کو کینسر ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا دیکھتی ہے۔میرے لیے یہ ڈرامہ کرنا انتہائی تکلیف دہ تھا کیوں کہ یہ رول کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ اپنی بیٹی کا خیال آتا تھا۔ میں بیمار پڑگئی۔ پرتھوی راج جی نے سکھایا تھا کہ جب کوئی رول کرو تو اُس میں اس طرح سما جاؤ کہ کوئی تمہارا دل بھی چیر کر دیکھے تو اُسی طرح دھڑکتا ملے جیسے اُس کردار کے دل کو دھڑکنا چاہیے۔ میری حالت دیکھ کر کیفی نے رمیش تلوار کو بلا کر کہا ''میری بیوی کو بخش دو۔'' تو رمیش نے ڈرامہ بند کردیا۔کئی برسوں تک میں نیا پلے کرنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ اِس سے پہلے میں 'الیکشن کا ٹکٹ' 'آذر کا خواب' وغیرہ میں کام کر چکی تھی۔ 1983 میں میں نے 'Enter a Freeman' کیا جس کا ترجمہ اور ڈائرکشن دونوں رنجیت کپور نے کیا تھا۔ ستیش کوشک نے (جو مجھ سے عمر میں بہت چھوٹا ہے) میرے شوہر کا رول بخوبی نبھایا تھا۔ یہ میرا آخری ڈرامہ تھا۔

○

میری فلمیں

1970-71 کے آس پاس اپٹا کے ساتھیوں نے سوچا کہ ایک فلم بنائی جائے اور بینر کا نام رکھا گیا تھری ایم ایم۔ عصمت آپا کی ایک کہانی لی گئی۔ سب ساتھیوں نے سنی، جس میں ایم . ایس. ستھیو، شمع زیدی، کیفی اور ایشان آریہ شامل تھے۔ اُسے فنانس کے لیے فلم فائنانس کارپوریشن کو بھیجا گیا۔ ایف ایف سی کو کہانی پسند نہیں آئی اور اُنھوں نے فنانس کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر کیفی سے درخواست کی گئی کہ اسکرپٹ لکھیں۔ کیفی تین چار دنوں میں ہی نئی اسکرپٹ لکھ کر لے آئے۔ سب کو بے حد پسند آئی اور ایف ایف سی فنانس کرنے پر راضی ہوگئی۔ ستھیو ڈائرکٹر بنے۔ ایشان کیمرہ مین اور ابو شیوانی پروڈیوسر۔ کاسٹنگ شروع ہوئی۔ مرکزی رول کے لیے بلراج ساہنی کے پاس میں اور کیفی گئے۔ اُنھوں نے غور سے کہانی سنی۔ کہنے لگے ''کیا آپ سب کو اُمید ہے کہ یہ مسلم کیرکٹر میں کر سکوں گا۔؟'' میں نے اُن کی خوب تعریف کی اور کہا ''جب آپ 'دو بیگھا زمین' میں ایک مجبور کسان کا اور 'کابلی والا' میں پٹھان کا رول اتنا اچھا کر سکتے ہیں تو یہ رول اُس کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔'' بڑی مشکل سے وہ راضی ہوئے۔ اپنے کیرکٹر کی تہہ تک پہنچنے کے لیے وہ بھیونڈی میں ایک مسلم کامریڈ کے گھر میں کئی دن تک رہے۔ اُس

کامریڈ کے والد کا بغور مشاہدہ کرتے رہے کہ وہ کس طرح وضو کرتے ہیں اور کس طرح نماز پڑھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ شوٹنگ شروع ہونے سے کئی دن پہلے وہ اپنے کیرکٹر میں آگئے تھے۔

آگرے میں شوٹنگ ایک گھر میں شروع ہوئی۔ شوٹنگ کا ماحول بہت دلچسپ تھا۔ اِپٹا کے سب لوگ، بلراج ساہنی سمیت، ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ سیٹ پر بالکل گھر جیسا ماحول تھا۔ ستھیو چاہتے تھے کہ بالکل realistic film بنے میلو ڈرامے کے بغیر۔ کیفی نے اتنے نیچرل سین لکھے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ میں ڈائیلاگ بول رہی ہوں۔ کیفی نے اپنے اور شبانہ کے رشتے کو سامنے رکھ کر بلراج ساہنی اور فلم میں اُن کی بیٹی گیتا ہنگوڑی کے سین لکھے تھے۔ فلم میں گیتا اور فاروق شیخ بھائی بہن بنے تھے۔ اُن کے سین کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بالکل بابا اور شبانہ کے بیچ ہو رہے ہیں۔ مجھے اپنے کیریکٹر پر کچھ خاص محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ میں نے اپنی ماں کے کردار کو کاپی کیا تھا۔ صرف بیٹی کی موت پر کفن پھاڑنے کا جو سین تھا اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے کیفی کو اپنی ماں کا قصہ کبھی سنایا تھا۔ ابا جان پنشن کے بعد اپنے آبائی وطن لوہاری آگئے تھے۔ لوہاری میں اُن کا تین منزلہ گھر تھا برسوں پہلے اماں جان اِسی گھر میں دُلہن بن کے آئی تھیں لیکن اب وہاں ابا جان کی بہن رہتی تھیں۔ ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بہن سے گھر چھوڑنے کو نہیں کہیں گے۔ چنانچہ اماں جان کو قریب کے ایک کچے گھر میں رہنا پڑا۔ اپنے آخری وقت میں اُنھوں نے ابا جان سے کہا تھا ''جب تک میں اپنے گھر میں نہیں جاؤں گی چین سے نہیں مر سکوں گی۔ ایک بار مجھے وہاں لے چلو۔'' بھائی جان اُنھیں اپنی گود میں

اُٹھا کر اُس کمرے میں لے گئے جہاں برسوں پہلے اُن کی ڈولی آئی تھی اور وہیں اماں جان نے دم توڑ دیا۔ یہ قصہ کیفی نے 'گرم ہوا' میں تقریباً جوں کا توں ڈال دیا تھا۔

'گرم ہوا' کو بہت سارے ایوارڈ ملے۔ کیفی کو نیشنل ایوارڈ ملا اور تین فلم فیئر ایوارڈ بھی۔ سب لوگ مانتے ہیں کہ ہندوستان کے بٹوارے پر اِس سے بہتر فلم آج تک نہیں بنی۔

ایشان آریہ بہت دلچسپ لڑکا تھا۔ ایشان دراصل میری بڑی آپا جان لیاقت خانم کا بیٹا تھا۔ شوٹنگ کے دوران خوب لطیفے سناتا اور سب کو ہنساتا رہتا تھا۔ وہ اپنے کام میں جینئس تھا۔ اُسی نے سب سے پہلے آوٹ ڈور شوٹنگ کرنے کے لیے ریفلیکٹر کا استعمال کرنے کی بجائے ایک سفید چادر کا استعمال کیا جس کی روشنی سے آرٹسٹوں کی آنکھیں چندھیاتی نہیں تھیں۔ آرٹسٹ بہت اطمینان سے اپنا کام کر سکتے تھے۔ اِس ٹیکنیک کا استعمال ایشان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ آج سب اُسی ٹیکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔ فلم کا بجٹ بہت کم تھا۔ بے چارے کیمرہ مین کے پاس صرف پانچ لائٹیں تھیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ڈبنگ کے ڈائیلاگ ریکارڈ کرنے کے لیے ضروری آلات نہیں تھے۔ جب ڈبنگ کا وقت آیا تو ساؤنڈ ٹریک نہ ہونے کی وجہ سے بہت تکلیف ہوئی۔ یعنی فلم تو تھی آواز نہیں تھی۔ پھر ہم سب اداکاروں کو اپنے ہونٹوں کی جنبش کے مطابق ڈبنگ کرنی پڑی۔ خوش قسمتی سے ڈبنگ اتنی صحیح اور اچھی ہوئی کہ کسی دیکھنے والے کو اندازہ بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ کام کس مصیبت سے ہوا ہے۔ بدقسمتی سے بلراج ساہنی جو اِس فلم سے بہت خوش اور متاثر تھے، اِسے نہ دیکھ سکے۔ ڈبنگ مکمل ہوتے ہی دوسرے دن

اُنھیں دل کا دورہ پڑا اور وہ ختم ہو گئے۔ بلراج ساہنی نے شوٹنگ کے دوران ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی اور نہ دوسری شوٹنگ کے لیے کہیں گئے۔ چار مہینوں تک وہ انتہائی لگن اور محنت سے کام کرتے رہے۔ اکثر وہ ہنس کر ڈائرکٹر ستھیو کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اِس فلم کے ختم ہونے کے بعد ستیہ جیت رے کو بھی ڈاڑھی رکھنی پڑے گی (کیونکہ ستھیو کے ڈاڑھی تھی)۔

اِس کے بعد مظفر علی نے مجھے 'امراؤ جان' میں خانم کا رول آفر کیا۔ میں امراؤ کی ماں کا رول کرنا چاہتی تھی لیکن سبھاشنی نے (جو اُس وقت مظفر کی بیوی تھی) مجھے قائل کیا کہ خانم کا رول ہی میرے لیے صحیح ہے کیونکہ امراؤ کی ماں ایک کمزور اور مظلوم کردار ہے۔ جب کہ خانم ایک مضبوط اور باوقار عورت، یہ رول مجھ پر زیادہ سجے گا۔ شکر ہے کہ میں نے سبھاشنی کی بات مان لی۔ خانم کے رول میں میرے کام کی تعریف لوگ آج بھی کرتے ہیں۔ کیفی نے فلم دیکھ کر سبھاشنی سے کہا ''شوکت نے خانم کے رول میں جس طرح حقیقت کا رنگ بھرا ہے اگر شادی سے پہلے میں نے اِن کی اداکاری کا یہ انداز دیکھا ہوتا تو اِن کا شجرہ منگوا کر دیکھتا کہ آخر سلسلہ کیا ہے!''

ایک دن صبح صبح، میرا نائر فون کر کے میرے گھر، جانکی کُٹیر، آئی۔ کہنے لگی ''شوکت آپا میں ایک فلم بنا رہی ہوں جس کا نام ہے 'سلام بامبے'۔ میں چاہتی ہوں آپ اُس فلم میں کام کریں۔'' میں نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ بے دلی سے پوچھا، ''کیا فلم ہے۔؟'' اُس نے تفصیل سے فلم کی کہانی سنائی اور بتایا ''یہ فلم کماٹی پورہ کی طوائفوں کے ماحول پر بن رہی ہے۔ آپ کا رول گھر والی کا ہے۔'' میں نے پوچھا، ''گھر والی کون؟'' تو اُس نے بتایا ''جو عورت لڑکیوں سے پیشہ کرواتی ہے

اُسے گھر والی کہتے ہیں۔'' میں چونک گئی، ''گھر والی کا رول۔۔! اُس کیرکٹر کو تو میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں۔'' اندر سے شبانہ کی آواز آئی ''ممی ان کی پکچر ضرور کیجیے۔ یہ اچھی ڈائرکٹر ہیں۔'' میں نے اس سے پوچھا ''اِس سے پہلے آپ نے کوئی فلم بنائی ہے؟'' اُس نے تفصیل سے بتایا ''کیبرے ڈانسروں پر ایک ڈاکیومنٹری بنائی ہے۔ اُس کے کیسٹ میں آپ کو دوں گی۔ ضرور دیکھئے گا۔ میں نے اُن کے گھروں میں جاکر شوٹنگ کی ہے۔ شوٹنگ میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ پولس نے بھی کافی پریشان کیا۔ لیکن ہم پکچر بنا لے گئے۔'' مجھے کچھ کچھ دلچسپی ہونے لگی۔ میں نے پوچھا ''آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ یہ رول میں کر سکتی ہوں؟'' اُس نے کہا ''میں نے آپ کی 'گرم ہوا' دیکھی۔'' میں نے حیرت سے پوچھا ''گرم ہوا'۔۔! میں نے تو اُس میں ایسا کوئی رول نہیں کیا۔۔'' وہ ہنس دی، اور کہا ''میں نے محسوس کیا کہ آپ کیرکٹر کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں، اپنے آپ کو نہیں۔'' میں نے پوچھا، ''مگر یہ تو بتائیے کہ میں نے جس کیرکٹر کو دیکھا تک نہیں میں وہ کیرکٹر کیسے کر سکتی ہوں۔؟'' میرا نے جواب دیا ''میں آپ کو اُس ماحول میں لے جاؤں گی اور سب سے ملاؤں گی۔ میں ڈیڑھ سال سے وہاں کام کر رہی ہوں۔ بیس پچیس بچوں کا ورک شاپ بھی چلایا ہے۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔''

''اچھا تو کل چار بجے آپ آیئے تو میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' میں نے کہا۔

دوسرے دن میں اُس کے ساتھ کماٹی پورہ گئی۔ جو بمبئی کا مشہور ریڈ لائٹ ایریا ہے۔ میری نظریں اپنے کیرکٹر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک درخت کے نیچے وہ کیرکٹر مجھے مل گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنے کسی مرد دوست کے ساتھ رمی کھیل

رہی تھی۔ میں غور سے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر قریب بیٹھ کر اُس سے بات بھی کی۔ اُس کا ہاتھ جلا ہوا تھا۔ جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا ساری فضا کچھ گھناؤنی سی تھی۔ ماحول اِس قدر گندہ تھا کہ مجھے متلی سی ہونے لگی۔ میں اُٹھ گئی اور گھر آ گئی۔ یہ رول میرے لیے challenging تھا اِس لیے میں اُسے کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ کچھ چار پانچ دن مسلسل میں میرا کے ساتھ وہاں جاتی رہی۔ تب کہیں میں اپنے آپ کو پوری طرح اُس کیرکٹر میں ڈھال سکی۔ میرا نائر نے شوٹنگ کے دوران میک اپ کے لیے قریب کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں دو کمرے میک اپ رومز کے لیے کرائے پر لے لیے تھے۔ پہلے دن جب میں میک اپ کر کے آئی تو لوگ مجھے پہچان نہیں سکے۔ میرے پہلے شاٹ سے ہی میرا خوش ہو گئی۔

جلد ہی میں نے کماٹی پورہ کے اُس ماحول کو پوری طرح سمجھ لیا اور اب مجھے اُس گھر والی کا کیرکٹر بہت دلچسپ لگنے لگا۔ مجھے اپنی کامیابی کا احساس اُس دن ہوا جس دن وہاں کی لڑکیوں نے ہنستے ہوئے کہا ''باپ رے۔۔ کون کہتا ہے کہ یہ شبانہ کی ماں ہے۔ یہ تو سچ مچ کی گھر والی ہے۔ کیسے بڑی بڑی آنکھ کر کے ہمیں دیکھتی ہے۔''

یہ فلم کامیاب ہوئی اور نیو یارک میں پچیس ہفتے چلی۔

اِس کے علاوہ میں نے کئی اور فلموں میں بھی کام کیا جیسے 'بازار' 'انجمن' وغیرہ۔ آرٹ فلموں کے تمام پروڈیوسر، ڈائرکٹر تو اچھی طرح جانتے تھے کہ میں اسٹیج کی بڑی ایکٹریس ہوں اور مجھے پوری عزت دیتے تھے۔ البتہ کچھ کمرشیل فلموں کی شوٹنگ کے دوران مجھے عجیب تجربے ہوئے۔ جو میں نے صرف پیسوں کی خاطر کی

تھیں۔ لیکھ ٹنڈن ایک فلم 'رومیو' بنا رہے تھے جس میں شمی کپور ہیرو تھا۔ اُس میں میرا بھی ایک چھوٹا سا رول تھا۔ شوٹنگ کے لیے جب میں اسٹوڈیو پہنچی تو پتہ چلا کہ مجھے میک اپ مردوں کے میک اپ روم میں کرنا پڑے گا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میک اپ کرکے چپ چاپ سیٹ پر چلی گئی۔ جب پہلا شاٹ دیا تو سیٹ پر سب چونک گئے۔ لنچ بریک کے دوران رندھیر کپور، جو راج کپور کا بڑا بیٹا ہے اُن دنوں لیکھ ٹنڈن کا اسسٹنٹ تھا، اُس کو پتہ چلا کہ میرا میک اپ روم مردوں کے کمرے میں ہے تو وہ بہت ناراض ہوا اور اُس نے فوراً میرے لیے ایک الگ میک اپ روم کا انتظام کر دیا۔ مجھے اپنے کام پر ہمیشہ اعتماد رہا ہے اور میں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ لوگ مجھے عزت دیں تو میرے کام کی وجہ سے۔

اپنی کمرشیل فلموں میں میری پسندیدہ فلم 'ہیر رانجھا' ہے۔

ریڈ فلیگ ہال سے جانکی کٹیر، جُوہُو تک

1959 میں ہم کو ریڈ فلیگ ہال چھوڑنا پڑا۔ ریڈ فلیگ ہال ہرکشن داس ہاسپٹل کا حصہ تھا اور ہاسپٹل کو اُس جگہ کی ضرورت تھی۔ کیفی بیچارے گھر کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ چونکہ مقبول شاعر تھے اِس لیے طرح طرح کے لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ خوش قسمتی سے اُن کے جاننے والوں میں ایک صاحب برلا کے داماد تھے۔ اُن کے ذریعے کیفی کو جانکی کٹیر میں ایک کاٹج نما گھر مل گیا۔ کرایہ دو سو پچیس روپے تھا۔ وشوامتر عادل ہمارے گھر کے بالکل قریب ایک دوسرے کاٹج میں رہتے تھے۔

شادی کے بارہ سال بعد پہلی بار مجھے سچ مچ کا گھر ملا تھا جس میں دو کمرے تھے اور پہلی بار الگ کچن بھی۔ میں خوشی سے کِھل اُٹھی۔ سامنے لان بھی تھا جس سے کیفی بھی بہت خوش تھے۔ ہم دونوں خوش تو بہت تھے لیکن سچ یہ ہے کہ اُس گھر میں نہ تو کوئی پرائیویسی (privacy) تھی اور نہ ہی مہمانوں کے لیے بیٹھنے کی کوئی جگہ۔ ہم دونوں ہی گھر کو آرام دہ بنانا چاہتے تھے لیکن یہ کام کیسے ہو اِس بات پر ہمیشہ بحث ہوتی تھی، میں کچھ کہتی تھی اور وہ کچھ۔ کیفی کے مشوروں کو میں بے تکا سمجھتی تھی اور وہ میرے مشوروں کو۔ آخر ہم نے سمجھوتہ کر لیا، چونکہ کیفی کو باغبانی کا بہت شوق تھا تو پھول پودے وہ اپنی مرضی سے لگائیں گے، گھر کا ڈیکوریشن میں کروں گی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے معاملوں میں قطعی دخل نہیں دیں گے۔

میں نے ایک برآمدہ بنایا جس پر کھپریل کی چھت ڈلوائی۔ تین فٹ اونچی دیوار بنوائی۔ اُس پر پلاسٹر لگانے کے پیسے نہیں تھے تو میں نے اُس کی اینٹیں ویسی ہی چھوڑ دیں لیکن پلاسٹر کے بغیر دیوار اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں کیفی کو ساتھ لے کر، جُوہُو بیچ سے بہت ساری سیپیاں اور کچھ چھوٹے چھوٹے پتھر چُن کر لے آئی۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے اُنھیں اینٹوں کے بیچ جڑ دیا۔ وہ دیوار اتنی خوبصورت لگنے لگی کہ آج تک میں نے اُس پر پلاسٹر نہیں لگوایا ہے۔

جیسے جیسے پیسے آتے گئے میں گھر کو اور سجاتی گئی لیکن صحیح معنوں میں 25 جانکی کُٹیر اِس لیے خوبصورت ہے کہ وہ ہمیشہ اوپن ہاوز رہا۔ اِپٹا کے تمام لوگ، کیفی کے ساتھ کام کرنے والے مدنپورے کے ورکر، چھوٹے بڑے شعرا، شبانہ کے فلم انسٹی ٹیوٹ کے اسٹرگلرز (strugglers)، سب کے لیے جانکی کُٹیر ایک اڈہ تھا۔ کبھی کبھی کیفی مجھے شام کے چار بجے، سر کھجاتے ہوئے، بتاتے کہ اُنھوں نے کچھ

لوگوں کو رات کے کھانے پر بلا لیا ہے۔ میں پوچھتی کتنے لوگ؟ تو دھیمی آواز میں کہتے ''یہی کوئی دس پندرہ۔'' میں کہتی ''ہائے کیفی تم نے مجھے صبح کیوں نہیں بتایا۔ کم ازکم میں ٹھیک سے انتظام کر لیتی۔'' جواب ملتا ''میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم ناراض نہ ہوجاؤ۔'' میں سر پیٹ لیتی لیکن پھر جیسے تیسے انتظام کر دیتی۔ کبھی کھانا کم نہیں پڑا۔

ہمارے گھر میں سب تہوار مثلاً عید، دیوالی، ہولی، کرسمس بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے۔ مجھے تہوار بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہندوستان مغربی ملکوں سے زیادہ خوبصورت اِس لیے بھی ہے کہ مغرب میں اتنے سارے اور اتنے حسین تہوار نہیں ہیں۔

ہم 15 ستمبر 1959، کو جانکی کُٹیر جُوہُو منتقل ہوئے تھے تو اُس کے تین دن بعد یعنی اٹھارہ ستمبر کو شبانہ کی نویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ میرا بیٹا بابا چھ سال کا تھا۔ جُو ہُو آکے بچوں کا اسکول جانا ایک مسئلہ بن گیا۔ شبانہ کا اسکول جُوہُو سے 14 کلومیٹر دور تھا۔ اب نو سال کی بچی جُوہُو سے بس میں سانتا کروز اسٹیشن، وہاں سے لوکل ٹرین میں گرانٹ روڈ اسٹیشن اور اسٹیشن سے پندرہ منٹ پیدل چل کر Queen Mary's High School کیسے پہنچتی۔ اسکول تو جُوہُو کے آس پاس بھی تھے لیکن شبانہ اپنا اسکول چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ شبانہ اور الیس کے لیے میں نے لوکل ٹرین کے پاس بنوا دیے۔ الیس تین مہینے تک شبانہ کو اسکول لاتی لے جاتی رہی۔ تین مہینوں میں ہی نو برس کی شبانہ اتنی independent ہوگئی کہ وہ اکیلے ہی اسکول جانے لگی۔ جب میری بہن قمر کو جو اُس وقت نائجیریا میں رہتی تھی، اِس بات کا پتہ چلا تو اُس نے مجھے خط لکھا، ''آپ بڑی ظالم ماں ہیں جو اتنی

چھوٹی بچی کو اتنی دور اکیلے اسکول بھیجتی ہیں۔'' شبانہ کے اسکول سے لوٹنے کا وقت شام چھ بجے تھا۔ میں ٹھیک چھ بجے لان میں بیٹھ کر اُس کا انتظار کرتی تھی۔ اگر کسی دن اُسے پانچ دس منٹ کی دیر ہوجاتی تو میرے پیر کانپنے لگتے تھے۔ میں ہزاروں دعائیں اور منتیں مانگنے لگتی تھی کہ خدا میری بچی کو بخیر و عافیت گھر تک پہنچا دے۔شکر ہے میری دعا ہمیشہ قبول ہوئی۔

بابا بہت چھوٹا تھا۔ اُس کا اسکول Hill Grange پیڈر روڈ کے علاقے میں تھا۔ اُس کی اسکول بس جُوہُو تک نہیں آتی تھی اِس لیے اُسے پیڈر روڈ کے اسکول سے نکال کر، پاس کے ایک اسکول میں داخل کروایا گیا۔

مجھے بھی جُوہُو سے ریڈیو اسٹیشن جانے میں پریشانی ہوتی تھی اِس لیے میں نے بھی ریڈیو اسٹیشن کو خیر باد کہہ دیا۔ اُنھیں دنوں ایلیک پدمسی نے (شیشوں کے کھلونے'' 'سارا سنسار اپنا پریوار' اور 'شاید آپ بھی ہنسیں') نام کے تین ڈرامے چنڈی گڑھ میں کھیلنے کا ارادہ کیا۔میں یہ تینوں ڈرامے تھیٹر گروپ میں کر چکی تھی لیکن میرے لیے چنڈی گڑھ جانا دشوار تھا کیونکہ اُس زمانے میں میں پاکستان جانا چاہ رہی تھی۔میرے بڑے بھائی کراچی سے آئے ہوئے تھے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔وہ اُس وقت وہاں کسٹمز میں ایک بڑے افسر تھے۔میرے زیادہ تر بھائی بہن پاکستان چلے گئے تھے لیکن ابا، اماں، میری دو بڑی بہنیں اور میں ہندوستان چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ میں چونکہ بہت عرصے سے اپنے بہن بھائیوں سے نہیں ملی تھی اِس لیے میں نے چنڈی گڑھ جانے سے منع کردیا۔'شاید آپ بھی ہنسیں' کے مصنف رفعت شمیم نے ایلیک کو بہت سمجھایا کہ ابھی تو تین مہینے باقی ہیں۔ شوکت کے رول میں کسی اور کو لے لیتے ہیں لیکن ایلیک نہیں مانے اور اُنھوں

نے اُردو ہندی ڈرامے کھیلنے ہی بند کر دیے۔

سفرِ پاکستان

میں خوشی خوشی بڑے بھائی جان کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہوگئی۔ 1960 کا زمانہ تھا اور اُس وقت بمبئی اور کراچی کے درمیان پانی کا جہاز چلتا تھا۔ پاکستان میں میرے بہن بھائیوں نے میری بہت خاطرداری کی۔ ہر جگہ گھمایا۔ حیدرآباد (سندھ) میں میرا چھوٹا بھائی نصراللہ خان بینک کا منیجر تھا۔ اُس کے پاس گاڑی تھی۔ اُس نے چھٹی لے کر ہم کو حیدر آباد کی کافی پرانی چیزیں دکھائیں۔ وہاں کے پرانے بازار بھی لے گیا۔ سندھ میں بنے شیشوں کے کام والے کپڑے بہت مشہور ہیں۔ وہ میرے لیے خریدے گئے۔ میرے پاس پیسے کہاں تھے۔ یہ تحفے میرے بہن بھائیوں نے دیے۔

ایک دن میرا وہ چچا زاد بھائی جو برسوں پہلے اورنگ آباد میں مجھے کیفی کے خط چپکے چپکے لا کر دیا کرتا تھا، مجھ سے ملنے آیا۔ اُس کا خاندان بھی کراچی منتقل ہوگیا تھا اور غالباً وہ کسی کالج میں پڑھا رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی اختر کے ساتھ مجھے سندھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹھٹھہ لے گیا۔ وہاں میں اُن عورتوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی جو بغیر کسی نمونے کے اپنے دل سے کپڑوں پر انتہائی خوبصورت رنگوں سے بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے بڑی فراخ دلی سے اُنھیں یہ صلاحیت دی ہے۔ مجھے یہ کپڑے بے حد اچھے لگے۔ اتفاق اور خوش قسمتی سے ایک دکان پر اُسی طرح کے کپڑے مجھے مل گئے۔ وہ بلاؤز کے ٹکڑے تھے۔ یہ کپڑے

بعد میں میرے بڑے کام آئے۔ کچھ عرصے بعد جب فلم 'ہیر رانجھا' شروع ہوئی، میں اُس کے کاسٹیوم ڈیزائن کر رہی تھی۔ٹھٹھہ کی عورتوں کے بنائے ہوئے کپڑے ہیر کے کاسٹیوم میں کام آ گئے۔ پاکستان کے شہر پشاور اور ملتان میں جو سلیم شاہی جوتے بنتے ہیں وہ واقعی بے مثال ہوتے ہیں۔ اُن کی زری اتنی پکی اور خوبصورت ہوتی ہے کہ برسوں میں بھی کالی نہیں پڑتی۔ مجھے یہ جوتے بہت پسند تھے۔ میرے چھوٹے بھائی نواب کو جب پتہ چلا تو مجھے ایک دکان پر لے گیا اور زبردستی بارہ جوڑی سلیم شاہی دلوا دیے۔

پاکستان میں کئی بار گئی ہوں۔ جب کیفی کے ساتھ گئی تھی تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ لاہور میں انارکلی بازار اور جہانگیر کا قلعہ بھی دیکھا۔وہاں مجھے وہ جگہ بہت پسند آئی جہاں چاروں طرف پانی کے فوارے تھے اور بیچ میں جہانگیر اور نور جہاں کے بیٹھنے کے لیے پتھر کے تخت بنے ہوئے تھے۔

میں جب بھی پاکستان گئی ہوں مجھے وہاں کے لوگوں میں اور اپنے وطن ہندوستان کے لوگوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا ہاں مجھے یہ احساس ضرور ہوا کہ وہاں کے لوگ بہت زیادہ مہمان نواز ہیں۔

پاکستان میں تین مہینے رہنے کے بعد میں بمبئی آ رہی تھی۔ میری چھوٹی بہن قمر بھی میرے ساتھ تھی۔اُس کی شادی پاکستان ہی میں ایک ڈاکٹر سے ہونے والی تھی جن کا نام شہر یار حسین تھا۔قمر کو بمبئی میں جہیز کا سامان خریدنا تھا۔

میں نے جہاز کے deck سے دیکھا کہ دور میرے غریب شوہر اپنے دونوں بچوں کی انگلیاں تھامے ہوئے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں زیوروں میں لدی پھندی تحفے تحائف سے بھرے تین سوٹ کیس لے کر اُتری۔ میرا بیٹا بابا اپنے

دل میں سوچنے لگا ''اتنے سونے کے زیور پہنے ہوئی عورت میری ماں کیسے ہو سکتی ہے۔''

کیفی بیچارے کے پاس کپڑے بہت کم تھے اور اُنھیں کسی فلم کے سلسلے میں کلکتے جانا تھا۔ میرے پاس بھائیوں کے دیے ہوئے ایک ہزار روپے تھے۔ میں نے جلدی جلدی کیفی کے چار جوڑے کرتے پاجامے بنا دیے اور وہ کلکتے چلے گئے۔

O

شبانہ اور بابا

ایک دن مجھے کیفی کے پرانے کاغذات میں اپنا ایک برسوں پہلے لکھا ہوا خط ملا۔ یہ اُس زمانے کا خط تھا جب میں پرتھوی تھیئٹر میں کام کرتی تھی اور ٹور پر تھی۔ اُس وقت شبانہ کی عمر دو سال کی تھی۔ہم اُسے پیار سے کبھی مُنّی کہتے تھے اور کبھی نونو۔ یہ خط میں نے بظاہر 2 برس کی شبانہ کو لکھا ہے لیکن دراصل مخاطب کیفی سے ہوں۔اُن دنوں میں اُن سے خفا تھی۔ یہ خط 1952 کا ہے۔

22 جنوری 1952

وجئے واڑہ

میرے پیارے نونو بیٹے!

ابھی ابھی میں اٹیچی صاف کر رہی تھی کہ اُس میں سے تمہاری دو تصویریں نکل پڑیں جو تمھارے ابا نے مجھے کشمیر میں بھیجی تھیں۔ میں ایک دم خوشی سے اُچھل پڑی ارے باپ رے تمھارا ربن تو بھوت بڑا ہے۔ اور تمہارا چھوٹا چھوٹا آنکھی بھوت پیارا ہے اور اُس پر بالوں کی لٹ پڑی ہوئی۔ اوہو! تمہارا ہاتھ میں گھڑی بھی بندیلا ہے۔ بھئی یہ گھڑی تو بھوت مہنگی ہے۔ ہم تو خرید بھی نئیں سکتا اور تم کو سوئٹر کون

بنایا؟ اُس میں کا چھوٹا چھوٹا پھول بھوت خوبصورت ہے۔ تمہارا صورت ہم کو بھوت اچھا دِکھتا۔ تم ہم کو بھوت یاد آتا۔ تم کو ہم پیار کرنے کو مانگتا۔ تم ہم کو اتنا یاد آتا کہ ہماری آنکھی میں پانی آجاتا۔ اور نونو، تمھارا دریا کا پانی سوکھ گیا۔ اور رانی باغ میں بندر کیسا کاٹا تھا؟ ایسا! باپ رے باپ ہم کو ڈر لگتا۔ بڈّا کیا بولتا؟ اللہ ایک بچہ دو۔ بڈّے کو بولو، نئیں نئیں، جاؤ جاؤ جاؤ، ہمارا ایک اِچ بچہ اچھا ہے۔ اور بیٹے تم ہم کو کیا بولتا تھا ممی تم کام کو نئیں جانا۔ ابا کو چائے نئیں بنانے کا۔ بیٹے یہ ہمارا سیٹھ ہے نا، بھوت خراب ہے۔ ہم کو زبردستی کام کو لے جاتا۔ ہم جلدی آئے گا اور اپنے لَپّو مَپّو کو پیار کرے گا۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ تم کس کا بیٹا ہے۔؟ ممی کا۔ اُوہو! میرا بیٹا۔ تم کجیلہ کس کا ہے؟ ممی کا۔ اُوہو! میرا کجیلہ۔ تم کس کا چاند ہے؟ ممی کا۔ اُوہو! میرا چندو بیٹا۔ تم کچو چچو کس کا ہے؟ ممی کا۔ اُوہو! میرا کچو چچو۔ اچھا سنو نونو، اب تمھارا طبیعت کیسا ہے؟ تمہارے دانے میں ابھی کھجلی ہوتا کہ نئیں؟ تمہاری دوا برابر آتی کہ نئیں؟ تمہارا ابا کیسا ہے؟ تمہارا دیکھ بھال برابر کرتا یا آوارہ گردی کرتا رہتا؟ تم کو کھانے کو سب چیز ملتا یا نئیں؟ سب لکھنا۔ ہم تمہارے واسطے چھوٹا سا چکلہ بیلن خریدا۔ اب تم کو یوسف سے لینے کی ضرورت نئیں پڑے گی۔ تم الگ روٹی پکانا۔ اور ہاں دیکھو اپنے ابا سے بولو کہ تمہاری آنٹی آمنہ ستائیس یا اٹھائیس جنوری کو تم کو دیکھنے، پیار کرنے کو آرہی ہے۔ اِس لیے تمہارے لیے فوراً باٹا کا جوتا لے آئیں اور موزے، سفید۔ اپنی آیا سے کہنا کہ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی جھالر والی اسکرٹ اور سفید آرگنڈی کا بلاؤز، نہایت عمدہ استری کیا ہوا، پہنائے اور بالوں میں دونوں طرف سفید ربن باندھے اور بیٹے تم اپنی آنٹی کو سلام کرنا اور بہت خاطر کرنا۔ ابا سے کہہ کر ساری چیزیں منگوالینا۔ گھر بے حد صاف رکھنا۔ ہلکے ہرے رنگ کے

دو پردے ہیں، اُن میں سے ایک کو پلنگ پر بیڈ کور کے طور پر بچھا دینا۔ اور دوسرے کو پڑھنے کی میز پر۔ تانبے کے گلدان کو راکھ سے صاف منجھوا کر رکھنا اور ویسے بھی پودوں میں ہر پندرہ دن میں پانی بدلواتے رہنا ورنہ اتنے قیمتی پودے مر جائیں گے۔اچھا بیٹے اب اجازت دو، ہم کو کام کرنے کا ہے۔تم کو دل سے بھینچ کر ایک کروڑ پیار۔ ٹاٹا

فقط

تمہاری پالی ممی

P.S. : تمہارے ابا کو ہمارا سلام بولنا، بشرطیکہ وہ تمہارے لیے دوسری ماں کا انتظام نہ کر رہے ہوں۔

شبانہ ایک بے حد حساس بچی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اپنے بیٹے بابا کو زیادہ چاہتی ہوں جو اُس سے تین سال چھوٹا ہے۔ شاید یہ تھوڑا بہت سچ بھی ہو کیونکہ میرا پہلا بیٹا جو شبانہ سے دو سال بڑا تھا، ایک سال کا ہو کر گزر گیا تھا۔ بابا نے آ کر اُس کی یاد کم کر دی تھی۔

جب شبانہ نو برس کی تھی اور بابا چھ برس کا، ایک بار ایسا ہوا۔ میں میز پر دونوں بچوں کو ناشتہ دینے میں مصروف تھی۔ دونوں کے اسکول جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اچانک ڈبل روٹی ختم ہو گئی۔ شبانہ کی پلیٹ میں ایک ٹوسٹ تھا۔ میں نے جلدی میں یہ کہہ کر ٹوسٹ اٹھا لیا ''بیٹے بابا کی بس آنے والی ہے میں نے نوکر کو ڈبل روٹی لانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ وہ آتا ہوگا۔ یہ ٹوسٹ بابا کو دے دو۔ تم کو تو ابھی جانے میں ٹائم ہے۔'' میں نے مکھن لگا کر بابا کو ٹوسٹ دے دیا۔ شبانہ منہ

سے تو کچھ نہیں بولی لیکن میز پر سے اُٹھ گئی اور باتھ روم میں جا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ تب تک ڈبل روٹی بھی آ گئی تھی۔ میں نے پکارا، ''شبانہ ! شبانہ !! لو بیٹے آپ کا ٹوسٹ آ گیا۔'' میں نے رونے کی آواز سنی۔ میں بھاگی ہوئی باتھ روم میں گئی۔ شبانہ نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے، اپنی کتابوں کا بیگ اٹھایا اور اسکول جانے کے لیے گھر سے نکل گئی۔ بعد میں اُس کی سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ لیبارٹری میں جا کر اُس نے نیلے تو تیا کا زہر کھا لیا۔ خدا نے مجھ پر رحم کیا کہ وہ نیلا تو تیا پرانا ہونے کی وجہ سے زہریلا نہیں رہ گیا تھا۔ شبانہ نے اپنی دوست پرنا کو صرف اتنا بتایا ''ممی بابا کو زیادہ چاہتی ہیں۔'' میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک بار شبانہ نے مجھ سے بدتمیزی سے بات کی، میں نے ڈانٹ دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ گرانٹ روڈ اسٹیشن پر ٹرین کی پٹری پر چلنے لگی تھی۔ ٹرین آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اتفاق سے اسکول کا چپراسی شبانہ کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے اُسے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور چلّایا '' بے بی بے بی ! کیا کرتا ہے!''

اِس طرح یہ دوبارہ بچ گئی۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اُس کے بعد میں اُسے ڈانٹتے ہوئے بھی ڈرنے لگی تھی۔

نو دس برس کی چھوٹی سی عمر میں بھی شبانہ نے اپنی کسی ضرورت، کسی خواہش کا اظہار مجھ سے نہیں کیا۔

اُس کے اسکول میں سفید کینوس شوز اُس کے یونیفارم کا حصہ تھے۔ یہ کینوس کے جوتے ہر دو چار مہینے میں پھٹ جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے جھلّا کر کہہ دیا ''اتنے بڑے کھبوڑے جیسے پیر ہیں کہ ہر تین مہینے میں جوتا پھٹ جاتا

ہے۔میں ہر تیسرے مہینے نیا جوتا کہاں سے لاؤں۔''

کچھ دنوں بعد میں نے دیکھا کہ اُس کا جوتا کن اُنگلی کے پاس سے پھٹ گیا ہے۔مگر اُس نے مجھے نہیں بتایا بلکہ اُس میں گتے کا ایک گول ٹکڑا کاٹ کر چپکا دیا۔ میں نے جب یہ دیکھا تو میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا اور میں نے کسی طرح جوڑ توڑ کر کے نیا جوتا اُسے دلا دیا۔

شبانہ کو جُو ہو سے سانتا کروز اسٹیشن آنے جانے کے لیے 30 پیسے ملتے تھے۔ جب کبھی چنا یا سینگ دانہ (مونگ پھلی) کھانے کو اُس کا جی چاہتا تو وہ جانکی کُٹیر سے دو اسٹاپ پہلے جُوہُو چوپاٹی پر اُتر جاتی اور پیدل چل کر گھر آتی۔ اِس طرح بس کے ٹکٹ کے جو پانچ پیسے بچتے اُن سے چنا یا مونگ پھلی خریدتی لیکن مجھ سے کبھی وہ پانچ پیسے نہیں مانگے۔ یہ بات بھی مجھے ایک زمانے بعد اُس کی دوست پرنا نے بتائی۔ جب میٹرک فرسٹ ڈیویژن میں پاس کر لیا تو اُسے کالج جانے کے لیے تین مہینے کا وقت ملا۔ پتہ نہیں اُس نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ پٹرول پمپ پر اگر Bru coffee بیچی جائے (جو اُس وقت نیا پروڈکٹ تھا) تو ہر روز 15 روپے ملتے ہیں۔ اگر دو جگہ کام کرے تو 30 روپے۔ اُس نے چپکے سے یہ کام کر لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ میں اپنے ڈرامے اور ریہرسل میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ مہینے کے ختم پر اُس نے مجھے نو سو روپے لا کر دیے۔ میں نے حیرت سے پوچھا، ''بیٹے یہ پیسے کہاں سے ملے۔'' تب اُس نے بتایا '' تین مہینوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں نے سوچا بیکار وقت گنوانے سے کیا فائدہ، کچھ کام کیوں نہ کروں۔'' پھر ساری بات بتائی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، یہ ننھا سا دل گھر کی غریبی سے کتنا متاثر ہے اور کیا کیا سوچتا ہے۔

سینٹ زیویرس کالج سے بی.اے کرنے کے بعد شبانہ نے ابا سے کہا ''میں آگے پڑھنا نہیں چاہتی بلکہ پونا انسٹی ٹیوٹ میں شریک ہو کر ایکٹنگ کورس کرنا چاہتی ہوں۔ شاید میں فلموں میں کام نہ کروں لیکن ٹیچر بن کر ایکٹنگ سکھاؤں گی۔'' کالج میں بھی شبانہ نے اسٹیج پر کافی کام کیا تھا۔ کیفی اپنی بیٹی کو اتنا چاہتے تھے کہ فوراً راضی ہو گئے۔ اُسے خود اپنے ساتھ پونا لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھی۔ انٹرویو کے دوران ٹیچر اُس کی صلاحیت سے حیرت میں پڑ گئے اور اُسے فوراً منتخب کر لیا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اُسے ڈھائی سو روپوں کی اسکالر شپ بھی مل گئی۔ اُس کی فیس دو سو روپیہ مہینہ جو ہمیں دینی پڑتی تھی، اب اسکالر شپ سے دی جانے لگی۔ شبانہ کی رپورٹ اتنی اچھی تھی کہ پہلے ہی سال میں اُسے فلم کا آفر بھی آ گیا لیکن اُس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا ''میں پہلے اپنا دو سال کا کورس ختم کرنے کے بعد ہی سوچوں گی۔'' دو سال بعد اُس نے فرسٹ کلاس میں کورس مکمل کیا اور اُسے انسٹی ٹیوٹ نے گولڈ میڈل سے نوازا۔

شیام بینیگل نے اُسے اپنی فلم 'انکور' کے لیے آفر دیا۔ یہ شبانہ کی پہلی فلم تھی۔ اور پہلی ہی فلم میں اُسے نیشنل ایوارڈ مل گیا۔ پھر فلموں کی قطار لگ گئی۔ لیکن شبانہ نے ہمیشہ بہت سوچ سمجھ کر فلمیں سائن کی ہیں۔ اُس نے کچھ کمرشیل فلموں میں کام کرنا اِس لیے منظور کیا تاکہ جب وہ کسی آرٹ فلم میں کام کرے تو لوگ اُس کے نام پر ایسی فلمیں بھی دیکھنے آئیں۔ جن دنوں فلموں میں وہ بے پناہ مصروف تھی، اُس کے سارے کانٹریکٹ اور پیسے میں ہی سنبھالتی تھی۔ اُس نے کبھی بھول کر بھی نہیں پوچھا کہ میں نے اُس کے پیسے کہاں رکھے، کیا کیے۔ ایک مرتبہ احمد آباد میں شوٹنگ کے دوران شبانہ نے کچھ چاندی کے زیورات خرید لیے۔ مجھ سے کہنے لگی

''ممی مجھ سے کافی فضول خرچی ہوگئی ہے۔ یہ چاندی کے زیور خرید لیے۔'' میں نے سمجھایا '' بیٹے یہ فضول خرچی نہیں ہے۔ تمہارا شوق ہے۔ اتنی محنت کرتی ہو۔ پیسے کماتی ہو۔ جو چیز تمہیں پسند آئے۔ خرید لیا کرو۔''

بچپن میں شبانہ کو کیفی کبھی کبھی اپنے ساتھ مزدوروں کی بستی یا میٹنگوں میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ اِس کا اثر بھی اُس پر تھا۔ کیفی کی وجہ سے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ رہا بھی کرتے تھے۔ مثلاً سجاد ظہیر، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری۔ ایک بار مخدومؔ محی الدین بھی ہمارے مہمان ہوئے تھے۔ شبانہ نے اپنے بچپن میں اِن لوگوں کی محفلیں دیکھی ہیں۔ ان کی باتیں سنی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آگے چل کے شبانہ کی جو شخصیت بنی اُس میں گھر کے ایسے ماحول کا بھی بڑا حصہ ہے۔

1985 میں شبانہ بنگال کے مشہور ڈائرکٹر گوتم گھوش کی فلم 'پار' کی شوٹنگ کے لیے کلکتے گئی۔ 'پار' کی کہانی بنگال اور بہار کے گاؤں کے اُن بے روزگار اور غریب لوگوں کے بارے میں تھی۔ جو دو وقت کی روٹی کی تلاش میں شہر آ کے گندی بستیوں میں اور فٹ پاتھوں پر رہتے ہیں۔ شبانہ جس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی وہاں جھاڑو دینے والی لڑکی بھی ایسی ہی ایک بستی کی تھی۔ کیونکہ فلم میں شبانہ کا کردار اِسی طبقے کی عورت کا تھا، اِس لیے شبانہ نے اپنے کردار کو سمجھنے اور بنانے کے لیے اِس لڑکی سے ذرا دوستی سی کر لی۔ ایک دن وہ لڑکی شبانہ کو اپنے گھر لے گئی۔ اُس کی غریبی دیکھ کر شبانہ کا سر چکرا گیا۔ وہ لڑکی اور اُس کے گھر والے جس حال میں زندگی بسر کر رہے تھے اُسے دیکھ کے شبانہ کا دل کٹ کے رہ گیا۔ وہ لوگ اپنی غریبی کے باوجود کتنے مہمان نواز تھے۔ جب شوٹنگ ختم ہوئی تو شبانہ نے سوچا، '' کہ میں

نے اِس لڑکی سے مل کر یہ سیکھا ہے کہ مجھے اپنا رول کس طرح کرنا چاہیے۔ کل یہ فلم ریلیز ہوگی۔ میری تعریف ہوگی۔ مجھے ایوارڈ ملیں گے لیکن اِس لڑکی کو کیا ملے گا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ میں اِسے اپنے کام، اپنے کیریر، اپنی شہرت کے لیے استعمال کر رہی ہوں۔ کل میں بمبئی واپس چلی جاؤں گی اور اپنی دنیا میں جا کے بھول جاؤں گی کہ وہ لڑکی جو مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کے اپنے گھر لے گئی تھی۔ آج بھی اُسی حال میں ہے اور شاید ہمیشہ یونہی رہے گی۔ کیا اُسے بھول جانا میری خود غرضی نہیں ہوگی۔ نہیں، میں بھولنا نہیں چاہتی اُسے۔ مجھے اُس لڑکی کے لیے اور اُس طرح جینے والے لوگوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔'' اُس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

بمبئی واپس آکر اُس نے آنند پٹوردھن کی فلم 'ہمارا شہر' دیکھی، جو جھونپڑپٹی کے بارے میں تھی۔ وہ فیصلہ جو اُس نے کلکتے کی شوٹنگ کے دوران کیا تھا، اُس کے دل میں اور مضبوط ہو گیا۔ وہ نیوارا حق سُرکشا سمیتی سے جُڑ گئی۔ یہ بمبئی میں فٹ پاتھوں اور جھونپڑ پٹی میں رہنے والوں کے لیے کام کرنے والی ایک انجمن ہے۔ اتفاق کی بات کہ اُسی زمانے میں قلابہ میں پچیس سال پرانی ایک جھونپڑپٹی کو، جس کا نام سنجے گاندھی نگر تھا، میونسپلٹی کے بے رحم لوگوں نے راتوں رات بلڈوزر چلا کر تہس نہس کر دیا تھا۔ نواراحق کے لوگ تڑپ گئے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر آپ اُنھیں یہاں سے نکال رہے ہیں کہ جہاں وہ پچیس سال سے رہ رہے تھے، تو یہ زمین کے بدلے جھوپڑپٹی والوں کو دوسری جگہ ملنی چاہیے۔ لیکن سرکار نے اِسے نہیں مانا۔ تب نواراحق کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کے خلاف بے مدت بھوک ہڑتال کریں گے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ بھوک ہڑتال آنند پٹوردھن اور جھونپڑ پٹی کے تین افراد کریں گے۔ شبانہ نے سوچا کہ ایسے وقت میں مجھے اِن کا ساتھ دینا

چاہیے۔ حالانکہ اُسے دوسرے دن مرنال سین کی فلم 'Genesis' کے لیے Cannes Film Festival فرانس جانا تھا۔ مگر اُس کے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ اِن لوگوں کو اِس حال میں چھوڑ کر چلی جائے۔ اُس نے جاوید سے ذکر کیا۔ (اُس وقت تک اُن دونوں کی شادی ہوچکی تھی۔) جاوید نے سنجیدگی سے سوچ کر جواب دیا ''تم ایک مشہور ایکٹریس ہو۔ جس جگہ وہ لوگ بھوک ہڑتال کر رہے ہیں وہ بہت ہی تکلیف دہ جگہ ہے۔ تمہیں بہت مشکل پیش آئے گی لیکن اگر تم یہ مشکل برداشت کر سکو تو اِن لوگوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔'' جب میں نے سنا تو میرے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ میں بے مدت ہڑتال کرنے کے حق میں بالکل نہیں تھی لیکن چپ رہی۔ کیفی پٹنہ میں تھے۔ شبانہ نے ابا کو فون پر بتایا تو اُنھوں نے کہا ''بیسٹ آف لک کامریڈ''۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ سب سے گلے مل کر بھوک ہڑتال کے لیے چلی گئی۔ یہ واقعہ مئی 1986 کا ہے۔ شام کو جب میں اپنی بچی سے ملنے گئی تو اُس جگہ کو دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ لبِ سڑک کچھ پھٹی چادروں سے برائے نام چھت بنائی گئی تھی۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ نیچے لکڑی کے تختوں پر موٹی سی دری بچھی ہوئی تھی۔ نہ گدا نہ تکیہ، بس اوڑھنے کے لیے کچھ پرانی پھٹی چادریں۔ اُس چھوٹی سی جگہ پر پانچ لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ جن میں ایک میری شبانہ بھی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن میں نے ظاہر نہیں کیا۔ آنسو تھے کہ اُمڈے چلے آرہے تھے لیکن میں پی گئی اور چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ لیے خوب نعرے لگائے تاکہ میری بچی کی ہمت نہ ٹوٹے۔ چوتھے دن میری ہمت نے جواب دے دیا۔ گھر آتے آتے میرے آنسو پاگلوں کی طرح بہنے لگے۔ ان لوگوں کے لیے میں کچھ اور تو نہیں کر سکتی تھی سوائے اپنے خدا سے دعا مانگنے کے ''خدا اِنہیں اِن کے مقصد میں کامیاب

کرے۔''

بھوک ہڑتال کا پانچواں دن تھا۔ ششی کپور شبانہ سے ملنے آئے۔ اُس وقت تک شبانہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ بلڈ پریشر بے حد گر چکا تھا۔ وہ فوراً ہی چیف منسٹر ایس بی چوہان سے ملے اور اُن سے کہا ''آپ ہم لوگوں سے وقت پڑنے پر چیریٹی شو وغیرہ کروا کر پیسے جمع کرنے کے لیے کہتے ہیں لیکن اِس وقت ہمارا ایک ساتھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے تو آپ کو اُس کی کوئی فکر نہیں؟'' ششی کپور نے اُنھیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور شبانہ کی طبعیت کے بارے میں بتایا۔ چیف منسٹر نے اُسی وقت بھوک ہڑتالیوں کی مانگ پوری کرنے کا حکم دیا۔ اب وہی ظالم افسران جو کل تک کہہ رہے تھے کہ کوئی اِن لوگوں کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے، سنترے کا رس لائے اور وعدہ کیا کہ سنجے گاندھی نگر والوں کو دوسری زمین دی جائے گی۔ اِس طرح بھوک ہڑتال ختم ہوئی اور میری بچی بچ گئی۔ میری جان میں جان آئی۔ کچھ عرصے بعد سرکار نے اُنھیں دوسری زمین دے دی جہاں اُنہوں نے اپنے گھر بنا لیے۔ یہ بھوک ہڑتال، ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے شبانہ کا پہلا قدم تھا۔

شبانہ کی سیاسی زندگی میں دوسرا ٹرننگ پوائنٹ صفدر ہاشمی کا بہیمانہ قتل تھا۔ صفدر ہاشمی جو خود ایک سماجی کارکن اور بہت اچھے رائٹر تھے۔ نکڑ ناٹک کیا کرتے تھے۔ دہلی کے قریب ایک انقلابی نکڑ ناٹک کے دوران انھیں کچھ سیاسی غنڈوں نے دن دہاڑے سڑک پر بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ اُس وقت دہلی میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول ہو رہا تھا جس میں شبانہ کی پہلی انگلش فلم Madame Sousatzka کا پریمیر ہونے والا تھا۔ شبانہ کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ شبانہ نے جب اپنے ہاتھ میں مائک لیا تو

لوگوں نے سمجھا کہ اب وہ اپنی فلم کے متعلق کچھ کہے گی لیکن اُسے تو کچھ اور ہی کہنا تھا۔ بہت ہی نڈر ہو کر اُس نے کہا ''ایک طرف تو یہ گورنمنٹ انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کرتی ہے اور دوسری طرف ہمارے Cultural Activist صفدر ہاشمی کو جب برسرِ اقتدار پارٹی کے غنڈے جان سے مار دیتے ہیں تو اُس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیتی۔'' یہ سنتے ہی audience میں بیٹھے ہوئے منسٹر آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ مسٹر ایچ کے ایل بھگت نے فوراً ہی اسٹیج پر پہنچ کر شبانہ کے ہاتھ سے مائک لے لیا اور کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور پتہ نہیں کیا کیا۔ ہم ٹی. وی. دیکھ رہے تھے۔ شبانہ کی یہ جرأت دیکھ کر جاوید اور کیفی تو بہت خوش ہوئے لیکن میں کچھ گھبرا سی گئی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُس فلم فیسٹیول میں بمبئی فلم انڈسٹری کے دوسرے ڈیلی گیٹس، بڑے بڑے پروڈیوسر اور ایکٹر اِس واقعہ کے بعد شبانہ سے ایسے لاتعلق ہوگئے جیسے پہچانتے ہی نہیں۔ بیچارے سوچتے ہوں گے کہیں اِس کے ساتھ ہم پر بھی سرکاری بجلی نہ گر پڑے۔ شبانہ بالکل تنہا ہوگئی۔

اخبار والوں نے شبانہ کی ہمت و جرأت کی خوب داد دی لیکن ایچ کے ایل بھگت نے سرکاری ریڈیو اور ٹی وی چینل پر شبانہ کے پروگرام بند کر دیے۔ پھر کچھ دن بعد راجیو گاندھی نے، جو اُس وقت وزیرِ اعظم تھے، کہا ''یہ بیوقوفی ہے۔ شبانہ پر سے یہ پابندی ہٹا دی جائے۔''

اِسی عزم و حوصلے سے قدم بہ قدم چلتے ہوئے شبانہ راجیہ سبھا کی ایم پی کے مقام تک پہنچی۔ اگست 1997 میں شبانہ راجیہ سبھا میں ممبر آف پارلیمنٹ بنی۔ اِندر کمار گجرال صاحب جو اُس وقت کے پرائم منسٹر اور وینکٹ رامن صاحب جو اُس وقت صدرِ جمہوریہ تھے، اُن دونوں کی مرضی سے شبانہ کو ایم. پی. نامزد کیا گیا تھا۔

ایم پی بننے کے بعد شبانہ نے بمبئی اور یو پی میں بہت کام کیے۔ سب سے پہلے بہت سے جھگی جھوپڑی والوں کے لیے گھروں کا انتظام کیا۔ اُن کے لیے بجلی اور پانی کی سہولت مہیا کروائی۔ باندرہ میں کارٹر روڈ اور بینڈ اسٹینڈ پر لوگوں کی تفریح اور چہل قدمی کے لیے چار کلومیٹر لمبا promenade بنوادیا۔ جُوہُو بیچ بھی بہت گندہ تھا۔ مجھے سویرے چہل قدمی کی عادت ہے۔ میں نے اُس سے ایک دن کہا ''بیٹے صبح جب میں جُوہُو بیچ پر چہل قدمی کے لیے جاتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ وہاں کتنی گندگی ہے۔ بمبئی کے امیر لوگوں کے لیے تو فائیو اسٹار ہوٹل ہیں لیکن غریبوں کے گھومنے پھرنے کے لیے یہی جگہیں ہیں۔ اِن کا خیال رکھا جانا چاہیے۔'' اُس نے اِس بات کو غور سے سنا اور بیچ کو صاف کرنے کی مہم چلائی۔ جس پہ ہر شام نہ جانے کتنے غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنی فیملی کے ساتھ آتے ہیں۔ اِس کے لیے مجھے شبانہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ شبانہ نے اپنے ایم. پی فنڈ سے ایک بڑی رقم جُوہُو میں ایک ایسے پارک کو بھی دی جہاں بچوں کے کھیلنے اور شام کو بڑے بوڑھوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ بمبئی میونسپل کارپوریشن نے اِس پارک کا نام کیفی اعظمی پارک رکھا ہے۔ ویسے ایک پارک کیفی کے نام پر پھول پور، اعظم گڑھ میں بھی بنا ہے جس میں مختلف قسم کے پودے اور بیج وغیرہ ملتے ہیں۔ پھول پور کے لوگ جانتے ہیں کہ کیفی کو باغبانی کا کتنا شوق تھا۔

شبانہ ایک بہت ہی sincere اور ایماندار ورکر ہے۔ اُس کے شوہر اُس کے ہم سفر جاوید اختر اُس کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اُس کے ہر کام میں اُس کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔

میرا بیٹا بابا، بچپن سے ہی بے انتہا حساس اور محبت کرنے والا ہے۔ اُسے

جانوروں سے بے انتہا پیار ہے،خاص طور سے کتوں سے۔ اُس کے بچپن کا ایک واقعہ میں ابھی تک نہیں بھولی۔ وہ سات سال کا تھا۔ایک دن اُس کے کمرے میں ایک تتلی اُڑتی ہوئی آئی۔ اور گر کر مر گئی۔وہ تڑپ گیا۔ اُسے اسکول جانا تھا جس کے لیے وہ تیار ہو رہا تھا۔ میرے پاس آیا اور رو کر کہا ''ممی اِسے زندہ کیجیے ورنہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔'' میں پہلے تو ذرا پریشان ہوئی لیکن پھر میں نے اُس معصوم سے کہا ''بیٹے میں ابھی اِسے پھول پر بٹھاتی ہوں۔ پھول کا رس اِس کی ٹانگوں سے ہوتا ہوا اِس کے جسم میں پہنچ جائے گا اور اِس میں پھر طاقت آجائے گی اور یہ پھر سے اُڑ جائے گی۔'' اُس کا بھولا پن دیکھیے کہ میری اِس بات پر یقین کر کے خوش خوش اسکول چلا گیا۔ ایسے بہت سارے واقعات ہیں جس سے اُس کی معصومیت اور رحم دلی کا پتہ چلتا ہے۔ جب میں اپنے بڑے بھائی جان کے ساتھ پانی کے جہاز سے کراچی جا رہی تھی تو کیفی اور شبانہ کے ساتھ بابا بھی مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر کوئی سات برس تھی۔ جہاز کے چلنے کی آخری سیٹی بج چکی تھی۔اتنے میں بابا کی نظر میرے سوٹ کیس پر پڑی اور اُس نے دیکھا کہ میری ساڑی کا ایک حصہ سوٹ کیس میں سے باہر لٹک رہا ہے۔ وہ فوراً تڑپ گیا اور بولا ''ممی ممی سوٹ کیس کھولو، ساڑی کا دم گھٹ رہا ہے۔'' میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ ساڑی میں جان نہیں ہوتی، ابھی جہاز چھوٹنے والا ہے، میں بعد میں ٹھیک کر دوں گی لیکن وہ نہیں مانا۔ آخر مجھے سوٹ کیس کھول کر ساڑی ٹھیک سے اندر رکھنی ہی پڑی۔شکر ہے کہ ساڑی کی جان بچانے میں میرا جہاز نہیں چھوٹا!

جاتے وقت میں شبانہ اور بابا کو کچھ پیسے دے گئی تھی۔ شبانہ میڈم نے تو فوراً اُڑا دیے لیکن بابا نے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا کیونکہ ''اِن میں سے ممی کی خوشبو

آتی ہے۔" اُس کی آیا ایلس نے مجھے بتایا کہ جتنے دن میں پاکستان میں رہی، وہ روز رات کو میرا بلاؤز اپنی آنکھوں پر رکھ کر سوتا تھا۔

اب وہ اتنا بڑا ہوگیا ہے، اتنا کامیاب کیمرہ مین ہے لیکن بچپن میں جیسا تھا بالکل ویسا ہی ہے۔ غریب طبقے کے لوگوں سے ہمدردی، صحیح اور غلط کا شدت سے احساس۔ جب وہ سترہ ایک سال کا تھا تو چیتن آنند کی فلم 'ہندوستان کی قسم' میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنا۔ ایک دن پتہ چلا کہ وہ شوٹنگ چھوڑ کے واپس آ گیا ہے۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا "وہاں ورکروں کے ساتھ نا انصافی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ کام وہی کرتے ہیں لیکن کوئی ورکر اگر ایک کپ سے زیادہ چائے مانگے تو اُسے نہیں ملتی۔ جب کہ ہم جیسے لوگ کتنا بھی کھانا ضائع کر دیں تو بھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ ورکر کے بغیر فلم نہیں بن سکتی اور اُس کے کھانے پینے میں فرق کرنا بری بات ہے۔" بابا میں نہ غلط بات کی برداشت ہے نہ جھوٹ بولنے کی عادت۔

جب وہ نو دس برس کا تھا تو میں نے دیکھا کہ اُس میں بے پناہ sense of rythem ہے لیکن introvert اور شرمیلا ہونے کی وجہ سے صرف میرے سامنے کھل کر شمی کپور کی نقلیں کرتا اور اُسی کی طرح ڈانس کر کے دکھاتا تھا۔ میں لاکھ منت کروں کہ کسی پارٹی میں ڈانس کردے تو کبھی نہیں کرتا۔ صرف جس روز شبانہ کی شادی ہوئی تھی تو ساری رات خوشی سے ناچتا رہا۔

ایک بار حیدر آباد میں تمام بچوں نے مل کر ایک ورائٹی پروگرام کیا تھا۔ بابا اُس وقت صرف چار یا پانچ سال کا تھا۔ اچانک کھڑے ہو کر بولا "ہم بھی ایکٹنگ کلے گا۔" پھر اُس نے ایک بوتل ہاتھ میں پکڑی اور شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اپنی

توتلی زبان میں 'دندی تھاب ہے تھاب میں جھوت تیا' (زندگی خواب ہے خواب میں جھوٹ کیا اور بھلا سچ ہے کیا۔۔ فلم جاگتے رہو کا مشہور گانا) اسٹیج پر کیا۔ خوب تالیاں بجیں۔ میں نے گلے سے لگا کر اُسے خوب پیار کیا۔

میرا خیال ہے کہ بابا میں ایکٹنگ کی بے پناہ سمجھ ہے اور اِسی لیے ایکٹر اُس کے ساتھ کام کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ کیمرہ مین ہونے کے باوجود اُسے اپنے کیمرہ اینگل سے زیادہ ایکٹر کی سہولت کی فکر ہوتی ہے۔ شاید اِس لیے عامر خان اُسے اتنا پسند کرتا ہے۔ کیفی کے ایک میوزک البم 'پیار کا جشن' مشہور سنگر اور موسیقار روپ کمار راٹھوڑ نے بنایا ہے۔ اُس میں ایک غزل ہے 'جب بھی چوم لیتا ہوں اِن حسین آنکھوں کو'۔ بابا نے جب اِس غزل کا میوزک ویڈیو بنایا تو عامر خان نے اُس میں خود اپنی خدمات پیش کیں اور مفت کام کیا۔

بابا نے اپنے کیریر کی شروعات ساؤتھ کے ڈائریکٹر باپو کے ساتھ کی تھی جو بہت اچھے پینٹر بھی ہیں۔ اُس نے باپو سے فریمنگ سیکھی اور میرے بھانجے ایشان آریہ سے لائٹنگ۔ دونوں اپنے کام میں ماہر تھے اور بابا اُن سے بہت متاثر ہوا۔ باپو کی فلمیں زیادہ تر ساؤتھ میں بنتی تھیں، کچھ تیلگو میں کچھ ہندی میں۔ بابا کا نام تو احمر ہے لیکن ساؤتھ میں لوگوں کو شاید بابا پکارنا زیادہ آسان لگا۔ لہٰذا دھیرے دھیرے اُس کا پروفیشنل نام بابا اعظمی بن گیا۔ اب احمر اعظمی صرف اُس کے پاسپورٹ اور چیک بک کے لیے رہ گیا ہے۔

بابا نے بطور کیمرہ مین زیادہ تر کمرشیل فلموں میں ہی کام کیا ہے جیسے مسٹر انڈیا، دل، تیزاب، بیٹا وغیرہ۔ کبھی کہتا تھا کہ بامقصد، آرٹ فلمیں زیادہ تر سلو (slow) اور بورنگ ہوتی ہیں اور اُسے ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن وقت کے ساتھ

ساتھ اُس میں تبدیلی آنے لگی ہے۔ آخر ہے تو کیفی کا بیٹا ! کتنے دن سماج کے مسئلوں سے بے نیاز رہ سکتا تھا ! اب، جب کہ ایک فلم ڈائریکٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اُس نے جو کہانی چُنی ہے وہ ایک ایسے فوٹو گرافر کے بارے میں ہے جو گاؤں واپس جا کر وہاں کے لوگوں کو آرگنائز کرتا ہے کہ وہ exploitation کے خلاف آواز اُٹھائیں۔ مجھے تو اِس کہانی میں کیفی کی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

1983 میں 'پیاری بہنا' کے سیٹ پر بابا کی ملاقات تنوی کھیر سے ہوئی جو اُس فلم میں ٹائٹل رول کر رہی تھی۔ تنوی بے حد اچھی ایکٹرس ہے اور بہت ذہین لڑکی۔ بابا اور تنوی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ تنوی کے والدین (مشہور اداکارہ اُوشا کرن اور ڈاکٹر منوہر کھیر) کو رشتہ منظور نہیں تھا اور وہ اِن کی شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بابا نے اپنے سسرال والوں کا دل ایسے جیت لیا کہ اب تنوی کو شکایت ہونے لگی ہے کہ اُس کے گھر والے اُس کی بہ نسبت بابا کو زیادہ پسند کرتے ہیں ! تنوی نے بھی ہمارے دلوں میں اپنی جگہ خوب بنا لی ہے۔ کیفی کی تو بہت ہی لاڈلی تھی۔ ہمیشہ اُسے پیار سے 'دلہن پاشا' کہہ کر پکارتے تھے۔ جنوری 2002 میں جب کیفی بیمار ہوئے تو بابا اُنھیں گاؤں سے دلی لے آیا تھا۔ شبانہ مراقش گئی ہوئی تھی۔ تنوی دلی آگئی اور ایک مہینے تک روز صبح شام اسپتال جا کے کیفی کی دیکھ بھال کرتی رہی۔

ہمارے گھر کے ماحول کو تنوی نے پوری طرح اپنا لیا ہے۔ وہ بڑی خوش مزاج ہے۔ اُس میں بہت صفات ہیں. انتہائی سلیقہ مند ہے۔ گھر بہت خوبصورت رکھتی ہے اور اُس کے گھر میں کھانا ہمیشہ بہت عمدہ ہوتا ہے لیکن اُس کی سب سے بڑی

خوبی ہے اُس کے مزاج میں دردمندی اور ہمدردی۔ جب بھی میری طبعیت خراب ہوتی ہے، تنوی چٹان کی طرح مضبوط ہو کر مجھے سہارا دیتی ہے۔

کیفی اور بابا کا رشتہ بہت گہرا تھا۔ کبھی کبھی دونوں ایک ساتھ کمرے میں گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے تھے لیکن اِس خاموشی میں ایک عجیب سا اطمینان ہوتا تھا۔ کیفی نے پیار سے اُس کا نام رس گُلا رکھا تھا کیونکہ اُس کے بات کرنے کا انداز بہت نرم ہے۔ بابا ہم سب سے بہت محبت کرتا ہے (اور ماں سے کچھ زیادہ ہی)۔

آہستہ آہستہ وہ بالکل کیفی کی طرح ہوتا جارہا ہے۔ کہتا ہے ''میں ابا کی طرح گاؤں جا کے کام تو نہیں کر سکتا لیکن اگر میں اپنے اطراف کے لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کر سکوں اور صحیح غلط میں فرق کر سکوں، تو میں سمجھوں گا کہ ابا کے دکھائے ہوئے راستے پر چل رہا ہوں۔''

میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میرے بچے اپنی زندگی میں خوش ہیں اور کیفی جن اُصولوں کے لیے زندہ رہے وہ اُصول ان بچوں میں زندہ ہیں۔

1997 میں مجھے دل کا دورہ سا پڑا اُس وقت میں کلکتہ، مشاعرے کے سلسلے میں، کیفی کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ شبانہ اور جاوید بھی اِس مشاعرے میں شریک تھے۔ صبح یہ دونوں میاں بیوی مجھ سے ملنے ہوٹل کے کمرے میں آئے۔ دیکھا کہ میں منہ لپیٹے لیٹی ہوں۔ کیفی نے اتنا کہا کہ شوکت کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ شبانہ تڑپ گئی، مجھے پکارا، میری شکل دیکھ کر کانپ گئی۔ دونوں میاں بیوی بھاگتے ہوئے ریسپشن پر گئے اور کسی طرح ڈاکٹر کو بلانے کا انتظام کیا جو ہارٹ اسپیشلسٹ تھا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ انھیں یہیں ہاسپٹل میں داخل کر دیجیے۔ شبانہ نہیں مانی، ڈاکٹر گوئل کو فون کیا۔ ڈاکٹر گوئل بمبئی میں امراضِ قلب کے بہترین ڈاکٹر مانے

جاتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ''اگر شوکت اس حال میں ہیں کہ اُنھیں بمبئی لایا جا سکتا ہے تو فوراً لے آؤ۔'' دونوں میاں بیوی مجھے بمبئی لے آئے اور بامبے ہاسپٹل میں داخل کروادیا۔ معائنے میں پتہ چلا کہ پانچ آرٹریز کم و بیش بلاک ہو گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک تو 90 فی صد بلاک ہو چکی ہے۔ آپریشن ضروری ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آپریشن کرواؤں گی۔ روز روز ہاسپٹل کون آئے۔ اس سے پہلے ایک آرٹری کی انجیو پلاسٹی ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کل ہی آپریشن کرنا پڑے گا۔ ایک دن میں سارا انتظام کرنا ان دونوں کے لیے کتنا مشکل تھا اس کا اندازہ مجھے اب ہوتا ہے۔

بارہ بجے رات تک جاوید اور شبانہ، ڈاکٹر بھٹا چاریہ کے پاس بیٹھے رہے صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ اس میں کتنا risk ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ risk صرف اتنا ہے جتنا سڑک پر چلنے والے آدمی کو کسی گاڑی سے ٹکر لگ جانے کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ ورنہ کوئی risk نہیں۔ پھر چھ بوتل خون اکٹھا کرنا تھا۔ اِس کے لیے شبانہ اور جاوید نے کئی نوجوان بچوں کو بلایا جس میں جاوید کا بیٹا فرحان اختر بھی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپریشن کامیاب ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اِنٹینسیو کیئر میں پایا۔ دیکھا سامنے شبانہ آنسو پونچھتی ہوئی کھڑی ہے۔ ایک نوجوان ڈاکٹر مجھ سے کہنے لگے ''آپ نے تو اتنی بہادری سے اپنا آپریشن کروالیا۔ یہ شبانہ اتنا کیوں رو رہی ہے۔'' میں نے کہا ''وہ میری بیٹی ہے اور مجھے بہت چاہتی ہے۔'' پانچ دن تک مجھے intensive care unit میں رکھا گیا۔ شبانہ رات میں زمین پر چادر بچھا کر وہیں سوجاتی تھی۔ پھر جب مجھے کمرے میں شفٹ کیا تو بیس دن تک شبانہ میرے ساتھ ہی رہی، کمرے سے باہر بھی نہیں نکلی۔ نہ

اُسے اپنے گھر کی فکر تھی نہ شوٹنگ کا کوئی خیال۔ اُس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ مجھے اچھا کر کے ہی لے جائے گی۔ ہاسپٹل کا کھانا خراب تھا۔ شبانہ نے اپنی دوست بھارتی (جس کا گھر نزدیک تھا) سے کہہ کر کھانے کا انتظام کروادیا۔

بھارتی نے اتنا اچھا ہلکا کھانا بھیجا کہ اسپتال کے کھانے سے میری جان بچ گئی۔ چنانچہ بیس دنوں کے بعد ڈاکٹر نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی اور شبانہ مجھے لے کر اپنے گھر آ گئی۔

○

کیفی کی بیماری

1973 کے اخیر میں جب میں 'گرم ہوا' کی شوٹنگ ختم کر کے آگرے سے بمبئی واپس آئی تو عادل نے مجھے بتایا کہ کیفی کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دن وہ ہمارے گھر میں کرسی سے اُٹھے تو اُٹھ نہیں پائے اور کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں سیدھی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا'' ڈاکٹر صاحب اِن کا بلڈ پریشر چیک کیجیے۔ یہ کوئی پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ نمک زیادہ کھاتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بلڈ پریشر لیا تو تب بھی 160 اوپر کا اور نیچے کا 100 تھا۔ ڈاکٹر کہنے لگا یہ کوئی بلڈ پریشر نہیں ہوتا۔ کوئی دوا کی بھی ضرورت نہیں۔ وہاں سے آنے کے چوتھے دن، 9 فروری 1973 کا وہ منحوس دن بھی آیا جب کیفی اور میری زندگی پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

رات کے نو بجے تھے۔ میں، کیفی اور دو چار دوست وشوامتر عادل، ذکیہ، ارشاد (میرا بھانجا) سب بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یونس پرویز کا فون تھا۔ یونس نے کیفی سے کہا کہ اُن کے دوست جو منسٹر بھی ہیں، کیفی سے ملنا چاہتے ہیں۔ میوزک ڈائرکٹر روشن کے گھر پر پارٹی ہے وہاں آجائیں۔ کیفی جانے کے لیے اُٹھے تو اُنھیں جیسے چکّر سا آ گیا۔ میں نے گھبرا کے

پوچھا: ''کیوں خیریت ؟''ہنس کے کہنے لگے: '' بیوی کو دیکھ کر ایسے ہی چکر آجاتا ہے۔'' سب ہنس پڑے میں چپ ہوگئی۔ کیفی روشن کی پارٹی میں چلے گئے۔

رات کے گیارہ بجے گیٹ کی گھنٹی بجی۔ میں نے دیکھا کیفی کو چار آدمی لاش کی طرح اُٹھا کر لا رہے ہیں۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پلنگ پر لِٹایا تو سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ بار بار ہاتھ سر پر جا رہا تھا جس سے پتہ چلتا کہ اُن کے سر میں شدید درد ہے۔ گھبراہٹ میں مجھے سارا گھر گھومتا نظر آنے لگا۔ میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی کہ: ''اے خدا! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں چیتن آنند کو فون کرسکوں۔ بڑی مشکل سے میں نے چیتن صاحب کو فون کیا کہ کیفی کی حالت بہت خراب ہے، جلدی سے آجایئے۔''

چیتن صاحب کیفی کے دوست تھے اور اُن سے 'ہیر رانجھا' لکھوا رہے تھے۔ فوراً اپنے بہنوئی، ڈاکٹر مدہوک کو لے کر ہمارے گھر پہنچے۔ ڈاکٹر نے کیفی کو دیکھا، بلڈ پریشر زیادہ تھا اور سر میں شدید درد، سانس اُکھڑی اُکھڑی چل رہی تھی۔ ہنس کر کہنے لگے: '' ارے کچھ نہیں، زیادہ پی لی ہے۔ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے۔'' میرا دل نہیں مانا۔ میں چونکہ ہومیوپیتھی پڑھتی رہتی تھی، میں نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب symptoms تو برین ہیمرج کے لگتے ہیں۔''

مدہوک ہنس کر کہنے لگے: '' آپ بھی عجیب ہیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں ایسا کہہ رہی ہیں۔''

وہ کچھ دوائیں لکھ کر چلے گئے۔ چیتن صاحب باندرہ سے وہ دوائیں لے آئے۔ دوائیں زکام کی تھیں۔ دوائیں دے کر وہ بھی اپنے گھر چلے گئے۔ بارہ بجے تک میرا بیٹا بھی آگیا۔ اُس وقت وہ سترہ سال کا تھا۔ وہ ابّا کی یہ حالت دیکھ کر

گھبرا گیا۔ میں رو رہی تھی۔ مجھے سینے سے لگا کر کہنے لگا: ''ممی آپ گھبرایئے نہیں، ابّا بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں اُن کے ہر ڈائرکٹر سے اُن کے علاج کے لیے وہ پیسے لے آؤں گا جو وہ ہضم کر کے بیٹھے ہیں۔'' مجھے لگا کہ میرا بیٹا اچانک سترہ سال سے ستائیس سال کا ہو گیا ہے۔شبانہ دلّی گئی ہوئی تھی۔ صرف میں اور میرا بیٹا تھے۔ ہم دونوں رات بھر بیٹھے رہے۔

تین بجے رات کو کیفی کا بایاں ہاتھ لکڑی کی طرح گرا۔ وہ نیم بے ہوشی میں چونک کر بولے: ''یہ کیا ہوا؟'' مجھے اُسی لمحے لگا کہ ہو نہ ہو یہ فالج کا اثر ہے۔ میں جلدی سے اُن کے پاس بیٹھ گئی اور اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ''کیفی: میں تمہارا ہاتھ تھامے ہوں۔'' رات کو چار بجے میرا بیٹا ہمارے فیملی ڈاکٹر جین کے گھر گیا۔ اُن کی بیوی نے کہا ہم ڈاکٹر کو نہیں اُٹھا سکتے۔ اُن کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔ میرا بیٹا وہیں بیٹھا رہا۔ صبح نو بجے ڈاکٹر جین کو لے کر آیا۔ کیفی کے دوسرے دوست بھی آ گئے تھے۔ مثلاً اُمیش ماتھر، ستھیو وغیرہ۔ ڈاکٹر جین نے چیک اپ کر کے کہا: ''اِنہیں فالج ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' کچھ دوا دے کر چلے گئے۔اتنے میں رباب جعفری کا فون آ گیا۔ میری خیریت پوچھنے لگیں۔ میری آواز بھرّائی ہوئی تھی، میں نے کہا: ''کیفی کو فالج ہو گیا ہے۔''

اُنھوں نے سردار بھائی کو بتایا۔ بس پھر کیا تھا۔ دونوں میاں بیوی کا فون ایک کے بعد ایک آیا: ''شوکت !تم کیفی کو لے کر فوراً بریچ کینڈی ہاسپٹل پہنچو۔ وہاں ہم کمرہ بُک کرا لیں گے۔''

میرے گھر میں اُس وقت صرف سو روپے تھے جو میں نے خیرات کے لیے کیفی کے تکیے کے نیچے رکھ دیے تھے۔ سلطانہ آپا کا پھر فون آیا: ''موتی تم فوراً کیفی

کو لے آؤ ورنہ اگر میں یہاں سے ایمبولینس لے کر آؤں گی تو اُس میں اور دیر ہو جائے گی۔'' اتنے میں ستھیو ایمبولینس لے کر آ گئے۔ اُس وقت دن کے بارہ بج چکے تھے اور کیفی پر بے ہوشی طاری ہوتی جارہی تھی۔ایک بجے کے قریب ہم برتیج کینیڈی ہاسپٹل پہنچے وہاں دونوں میاں بیوی، سردار بھائی اور سلطانہ آپا، دو برین اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

ڈاکٹروں نے کہا کہ اِن کی حالت نازک ہے۔ اگلے 75 گھنٹے اِن کے لیے بہت خطرناک ہیں اگر یہ وقت اِنھوں نے نکال لیا تو بچ سکتے ہیں۔ روتے روتے میری آنکھیں سوج گئیں تھیں۔کوئی چار بجے کیفی نے آنکھیں کھولیں۔ اِپٹا کے سبھی آرٹسٹ وہاں موجود تھے۔ گیتا سدھارتھ بھاگ کر میرے پاس آئی اور کہا: ''بھابھی جلدی سے منہ دھولو، کیفی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' میں بھاگ کر کیفی کے پاس گئی۔ اُنھیں ہوش آ گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے: ''تمہارے پاس الائچی ہے؟''

میں نے بٹوے میں سے الائچی نکال کر دی۔ میرے پاس سلطانہ آپا کھڑی تھیں، میں نے کہا: ''تم اِنھیں پہچانتے ہو؟''

بولے: ''ہاں کیوں نہیں یہ سلطانہ ہیں۔''

پھر اُن پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے ہم کو باہر جانے کے لیے کہا۔ کیفی کی بیماری کی خبر اخباروں میں آ گئی۔ پھر تو ملنے والوں کا تانتا سا بندھ گیا مگر ڈاکٹروں کا آرڈر تھا کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے۔ میرے دونوں بچے دروازے پر پہرے دار کی طرح کھڑے رہتے اور کسی کو اندر جانے نہیں دیتے (شبانہ دوسرے ہی دن دلّی سے آ گئی تھی۔ سکھ دیو نے اُسے ہوائی جہاز سے بھیج دیا تھا)اِپٹا کا کوئی انسان ایسا نہیں تھا جس نے کیفی کے لیے مندروں، درگاہوں پر جا کر دعائیں نہ

مانگیں ہوں۔

اُنھیں دعاؤں کا اثر تھا کہ اتنے بڑے اٹیک کے بعد وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگے۔ بریچ کینیڈی ہاسپٹل میں کسی کو مریض کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ میرا گھر دور تھا جب کہ سردار بھائی کا گھر اسپتال سے ذرا سے ہی فاصلے پر تھا۔ مجھے سلطانہ آپا اور سردار بھائی نے اپنے گھر بلا لیا۔

اُن کے گھر میں جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی تو میں پاگلوں کی طرح دوڑ کر فون پر پہنچ جاتی۔ سردار بھائی نے مجھے ٹیلیفون اُٹھانے سے منع کر دیا تھا، حتیٰ کہ دوپہر میں جب اُن کے سونے کا وقت ہوتا تھا، فون بجتا تو وہ خود ریسیو کرتے۔ میں روتی رہتی تو سلطانہ آپا مجھے سمجھاتیں کہ: ''موتی اگر تمہارے رونے سے کیفی اچھے ہو جائیں تو میں کہوں گی کہ ضرور روؤ، لیکن وہ تو علاج سے اچھے ہوں گے رونے سے نہیں، البتہ تمہاری طبعیت ضرور خراب ہو جائے گی، جب کہ تم کو اب زیادہ تندرست رہنا ہے کیفی کی تیمارداری کے لیے۔''

ہاسپٹل میں شام کے چار بجے سے لے کر سات بجے تک مریضوں سے ملنے کا وقت تھا۔ سلطانہ آپا، سردار بھائی روز میرے ساتھ ہاسپٹل جاتے اور ہر ضرورت پوری کرتے۔ کیفی icu میں تھے۔ اُن سے کوئی مل تو نہیں سکتا تھا، پھر بھی اُن کی عیادت کے لیے منسٹر سے لے کر جانکی کُٹیر کے مالی تک آتے تھے۔ اِن مالیوں سے کیفی کی بڑی دوستی ہوا کرتی تھی۔ بے چارے icu کے باہر کھڑے ہوکر یہی دعائیں مانگتے تھے کہ بھگوان، ہمارے بھگوان جیسے صاحب کو اچھا کر دے۔ ایک مہینے کے بعد کیفی ہاسپٹل سے گھر آ گئے۔ فالج نے اُن کے بائیں ہاتھ اور پیر پر اثر کیا تھا۔ پیروں سے تو وہ پھر بھی ذرا لنگڑا کے چل سکتے تھے۔ مگر بایاں ہاتھ پوری

طرح مفلوج ہوگیا تھا۔ میں دن رات اُن کی تیمارداری کر رہی تھی مگر وہ بہت depressed تھے۔ کبھی کہتے تھے ''تم مجھے چائے میں زہر دے دو۔ کبھی کہتے تھے کہ دیکھو وہ سامنے والی چھت سے اگر کوئی مجھے گولی مارے تو گولی سیدھی میری پیشانی پر لگے گی اور میں اِس کم بخت بیمار زندگی سے نجات پا جاؤں گا۔'' میں اُن کی ہمت بندھانے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر کچھ عرصے بعد، ایک دوست کے مشورے پر، اُنھیں کیرالا لے گئی۔ جہاں کُٹا کل میں ایک آیورویدک اسپتال ہے۔

وہاں علاج کے طریقے الگ ہی ہیں۔ کیفی کے سر کو shave کر دیا گیا، روز اُنھیں تیل کے ایک ٹب میں بٹھایا جاتا تھا، پھر مالش ہوتی تھی اور دن میں کئی بار ناک میں آیورویدک دوا کے قطرے ڈالے جاتے تھے۔ تاکید تھی کہ کیفی کُھلے آسمان کے نیچے نہیں بیٹھیں گے۔ ہم وہاں ایک مہینے رہے۔ کیفی کے ہاتھ پر فالج کا اثر تو ویسے کا ویسا رہا، لیکن کُٹا کل میں اِتنا ضرور ہوا کہ کیفی اپنے depression سے نکل آئے۔ مہدی جو کیفی کے بہت ہی پرانے دوست اور ہم سب کے لیے گھر کے ایک فرد کی ہی طرح ہیں، اُنھوں نے دلّی میں کیفی کے لیے ایک پروگرام منعقد کیا۔ جس میں مشہور گُلو کارہ بیگم اختر، کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر پی.سی.جوشی نے بھی شرکت کی۔ پی.سی. جوشی نے اپنی تقریر میں کہا کہ روس کی رائٹرز ایسوسی ایشن کو چاہیے کہ وہ کیفی کو علاج کے لیے روس بلائے۔ سروجنی نائیڈو کی بہن جو اِس جلسے میں موجود تھیں، اُنھوں نے غالباً اِس بات کو وہاں تک پہنچایا اور کیفی کو روس بھجوادیا۔ کیفی روس میں دو مہینے رہے اور بڑی حد تک صحت یاب ہوکر لوٹے، لیکن اُن کے بائیں ہاتھ پر فالج کا اثر کم نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہوگیا تھا۔ میں ہمیشہ کیفی کی آنکھوں کو دیکھتی رہتی تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں، کہاں جانا چاہتے ہیں۔ بیماری کے بعد اُن کا

گھومنے پھرنے کا شوق زیادہ بڑھ گیا تھا۔ شاید وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ وہ اِس بیماری کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوئے ہیں۔

1976 میں پٹنا اینٹی فاشسٹ پیس کانفرنس ہوئی۔ کیفی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اِس پیس کانفرنس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ میں بغیر کسی عذر کے تیار ہوگئی۔ ہم پٹنہ پہنچ گئے۔ کیفی کے چاہنے والے ہر جگہ موجود ہوتے تھے۔ ایک کامریڈ کے گھر مہمان رہے۔ کانفرنس میں پٹنہ کے مختلف گاؤں سے آئے ہوئے ایک لاکھ کسان لال جھنڈا لیے اِس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس بہت کامیاب ہوئی۔ کانفرنس کے بعد واپسی کے لیے جب ہم اسٹیشن پہنچے تو ایک عجیب ہی منظر تھا۔ اسٹیشن پر ایک لاکھ کسان لال جھنڈے لیے ہوئے اپنے اپنے گاؤں واپس جانے کے لیے چلے آرہے تھے۔ پورا اسٹیشن لال جھنڈوں سے بھر گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہمارے ساتھ ہماری میزبان لڑکی بھی تھی جو کیفی صاحب کے ساتھ چل رہی تھی۔ چار قلیوں نے ایک کرسی پر کیفی کو اُٹھا رکھا تھا۔ ایک کسان جو کمیونسٹ پارٹی کا لال بیج لگائے ہوئے تھا، بغل میں ڈنڈا دبائے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، جیسے وہ ہمارا محافظ ہو۔ میں اپنے ہاتھ میں پرس اور ناشتہ دان پکڑے ہوئے تھی کہ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گر پڑی۔ میرا پرس کہیں اور ناشتہ دان کہیں۔ قریب تھا کہ مجمع مجھے کچل ڈالتا، میں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ہمارے ساتھ چلنے والے کسان نے اپنی بغل سے ڈنڈا نکالا اور اُسے بنوٹ کی طرح گھمانے لگا۔ آنے جانے والے لوگ اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ اگر ذرا دیر ہوجاتی اور وہ کسان ڈنڈا نہ گھماتا تو میں لوگوں کے پیروں تلے دب کر ختم ہوجاتی۔ قلیوں نے کیفی کی کرسی نیچے رکھ دی اور وہ لڑکی کیفی کو بچانے

کے لیے کیفی پر جھک گئی۔ اِس طرح ہم دونوں کی جان بچ گئی۔ دیر تک میرا دل پتے کی طرح کانپتا رہا۔ یوں تو سفر کے دوران کئی حادثے پیش آئے لیکن یہ حادثہ اپنی نوعیت کا عجیب وغریب حادثہ تھا، جو آن کی آن میں ہماری جان لے سکتا تھا۔ لوگ ہمیں کچلتے چلے جاتے لیکن اُس کامریڈ کی حاضر دماغی نے ہمیں بال بال بچا لیا۔

اسی زمانے میں ہم 'جشنِ کیفی' کے سلسلے میں دوبئی گئے۔ وہاں مشاعرہ تھا۔ وہاں کے منتظمین کیفی کو غالباً ساٹھ ستر ہزار روپے کی تھیلی پیش کرنا چاہتے تھے لیکن کیفی نے اُس کی بجائے بمبئی اپٹا کے لیے کچھ کام کی چیزیں مانگ لیں۔ مثلاً کمپیوٹر، ویڈیو کیمرہ وغیرہ۔ سچ کہوں تو مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ پیسے ملتے تو دوبئی میں کچھ شاپنگ کرتی۔ مگر کیفی کی خوشی کی خاطر خاموش رہی۔

اسی طرح کچھ دنوں بعد امریکہ گئے۔ امریکہ کے بہت سے شہروں میں گھومے۔ یوں تو ہم ایک بار پہلے بھی آچکے تھے لیکن یہ سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ میں نے توبہ کر لی کہ اب امریکہ نہیں جاؤں گی۔ ایک تو ہر شہر میں دو یا تین دن کا قیام۔ پھر کیفی کا کام، اپنا کام، کپڑوں کو استری کرنا۔ کیفی کے کپڑے تو مشین سے دھل جاتے لیکن کیفی کو نہلانا، کپڑے بدلنا تیار کر کے مشاعروں میں لے جانا، میں بہت تھک جاتی تھی۔ کچھ دنوں سے کچھ بیمار بھی تھی۔

پارٹی نے مجھے اور کیفی دونوں ہی کو علاج کے لیے روس بھیج دیا۔ وہاں ہسپتال میں ہم دونوں کو الگ الگ کمروں میں ٹھہرایا گیا۔ جو مجھے اچھا نہیں لگا لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے اِس اسپتال میں ایک نئی زندگی ملی :۔میری بائیں چھاتی میں ایک Cyst ہوگیا تھا جو اگر یوں ہی رہتا تو کینسر میں تبدیل ہو جاتا۔ اُن لوگوں نے اُسے آپریشن

کر کے نکال دیا اور میری جان بچ گئی۔ وہاں کے لوگ بہت پیار کرنے والے تھے۔ بہت محبت سے پیش آتے لیکن میں ہاسپٹل کے ماحول سے تنگ آ گئی تھی۔ مجھے مستقل ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر فکر مند تھے۔ ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا: ''دیکھیے آپ مجھے ہمیشہ ایک تولیے کے ہاؤس کوٹ میں رکھتے ہیں جس سے میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ آپ مجھے چھٹی دیں اور مجھ کو میرے خوبصورت کپڑے پہننے کی اجازت دے دیں تو دیکھیے میرا بلڈ پریشر کس طرح نارمل ہو جاتا ہے۔'' اُن کی سمجھ میں آ گیا۔ میں ایک شام کیفی سے ملنے اُن کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ ایک روسی نوجوان میرے پاس آیا اور بالکل صاف ہندوستانی میں مجھ سے کہنے لگا: '' آپ مسز شوکت کیفی ہیں؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔''

بولا ''میں آپ کا ترجمان (interpreter) ہوں میں آپ دونوں کو یہاں سے ہوٹل لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو ہاسپٹل سے چھٹی مل گئی ہے۔''

میں خوشی سے چیخ پڑی: '' کیا واقعی !''

بھاگی ہوئی گئی، اسپتال والوں سے اپنے خوبصورت کپڑے واپس لیے اور اُن کے تولیے کا ہاؤس کوٹ اُن کے حوالے کیا۔ پھر ہم کیفی کو لے کر ہوٹل آ گئے جہاں کیفی کے بہت سے دوست جمع تھے۔ منیش، مرزا اشفاق بیگ اور کئی دوسرے کامریڈ۔ پھر ایک دوست نے کہا فیض احمد فیض بھی یہیں اسی ہوٹل میں ہیں۔ اُنھوں نے آپ دونوں کو بلایا ہے۔ میں تو خوشی سے ناچنے لگی۔ اپنے بہترین کپڑے پہنے۔ کیفی کو تیار کیا اور فیض سے ملنے اُن کے کمرے میں گئے۔ فیض اُس وقت تک شراب چھوڑ چکے تھے۔ ہم نے وائن پی اور دیر تک فیض صاحب سے ان

کی غزلیں اور نظمیں سنتے رہے۔ پھر اپنے کمرے میں آگئے۔ وہاں دو ٹکٹ ہمارے لیے رکھے ہوئے تھے۔ جارجیا کے شہر 'سُوچی' کے ایک ہالی ڈے ریسورٹ میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جارجیا بے حد خوبصورت ملک ہے۔ وہاں کے لوگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہاں کی لڑکیاں کوہِ قاف کی پریاں کہلاتی ہیں۔ میں تو بہت خوش ہوگئی۔

چنانچہ دوسرے دن ہم وہاں کے لیے اپنے ترجمان کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ وہ جگہ کسی جنت سے کم نہیں تھی۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب سمندر۔ سمندر کے کنارے سفید پتھر یا تو مرغی کے انڈے کے برابر یا قاز کے انڈے جتنے۔ بالکل سفید اور خوبصورت، سمندر کے کنارے ہر طرح کے کھیل کے سامان مہیا تھے۔ شطرنج، تھیئٹر، فلم ہر چیز کا انتظام۔ کھانا ناشتہ انتہائی لذیذ۔ ناشتے میں وہ اتنی چیزیں دیتے کہ ایک انسان اتنا کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک خوبصورت سی لڑکی کیفی کی ترجمان تھی اور ایک ہنڈسم سا لڑکا میرا ترجمان۔

انسانی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ باوجود اِس کے کہ وہ اتنی خوبصورت جگہ تھی کچھ ہی دنوں میں مجھے وہاں وحشت سی ہونے لگی کیونکہ وہاں اپنی زبان جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ افغانستان کے ایک کامریڈ وہاں تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کیفی سے اُن کی دوستی ہوگئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ کے پاس غزل وغیرہ کا کوئی کیسٹ ہو تو وقت گزارنے کے لیے مجھے دے دیجیے۔ یہاں تو اپنی زبان سننے کو کان ترس گئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر دیا اور کہا کہ اِس میں افغانستان کے ایک مشہور گلو کار کی گائی ہوئی دو اُردو غزلیں ہیں۔ کیا بتاؤں کیسی خوشی ہوئی مجھ کو۔ تمام دن وہ دو غزلیں سنتی رہتی تھی۔ پھر

ہمارے جانے کے دن قریب آ گئے۔ بلکہ میں نے ضد کر کے قریب کروائے۔ چلتے وقت ہمارے افغان کامریڈ نے وہ کیسٹ مجھے پریزنٹ کر دیا۔ ہم بمبئی آ گئے۔ روس اور جارجیا میں یہ لمبی چھٹی مجھے بہت راس آئی تھی۔ جو بھی مجھے دیکھتا کہتا، آپ کی عمر تو کوئی دس سال کم لگنے لگی ہے۔ بمبئی آ کے جب میں نے اپنا چیک اپ کروایا تو اِس بات کی تصدیق ہوئی کہ روس میں میرا آپریشن پوری طرح کامیاب ہوا تھا۔ کیفی بھی انتہائی صحت مندلگ رہے تھے۔ ایک زمانے کے بعد اُن کے چہرے پر اتنی رونق تھی۔ یہ 1983 کی بات ہے۔

کیفی کی زندگی کا دوسرا دَور

شبانہ جس زمانے میں راجیہ سبھا کی ایم. پی تھی، اُسے دہلی میں حکومت کی طرف سے ایک بڑا شاندار مکان دیا گیا تھا۔ اُس میں ایک بڑا سا کمرہ اُس نے میرے اور کیفی کے لیے رکھا تھا۔ ہم جب بھی جاتے وہیں ٹھہرتے تھے۔ ایک دن میں اپنے اُس کمرے میں لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ پاس ہی کیفی بھی دراز تھے۔ اُن دنوں اُن کی طبیعت کچھ خاص اچھی نہیں تھی۔ اچانک دو آدمی ایک بڑا سا بکسہ اُٹھائے ہوئے آئے اور پوچھا ''اِسے کہاں رکھیں؟'' کیفی کے ملازم گوپال نے کہا کہ ''اندر رکھ دیجیے۔'' میں نے گوپال سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' وہ بولا ''ائرکنڈیشنر ہے، جیٹ ائیر ویز کے مالک نریش گوئل صاحب نے ابا کو مجواں کی کمپیوٹر کلاس کے لیے بھیجا ہے۔'' یہ سن کر میں حیرت سے کیفی کو دیکھنے لگی۔ بیس برس پہلے کا مجواں جیسے میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

بیس برس پہلے۔۔۔

ہم صفدر بھائی کے گھر میں ہیں کیونکہ کیفی کے گھر پر رشتہ داروں کا قبضہ ہے۔ صفدر بھائی سے میں کہہ رہی ہوں، ''مجھے نہانا ہے۔ کہاں نہاؤں؟ یہاں تو کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔''

صفدر بھائی بولے: ''دلہن، تم فکر نہ کرو، میں، جہاں ٹیوب ویل میں پانی گرتا ہے وہاں دو چادریں باندھ دوں گا۔ وہیں نہا لینا۔ ابھی تو بجلی ہے ٹیوب ویل بند نہیں ہوگا۔''

میں جلدی جلدی نہانے کی تیاری کرتی ہوں۔ ابھی صابن لگا ہی رہی ہوں کہ ہوا چلنے لگتی ہے اور چادریں اُڑنے لگتی ہیں، میں چیختی ہوں: ''ہائے ہائے، اِدھر کوئی نہ آئے۔ پلیز کوئی نہ آئے۔'' اور جلدی جلدی جیسے تیسے نہا کر کپڑے بدل کر بھاگ آتی ہوں۔

مہمان آئے ہوئے ہیں۔ لکڑی نہیں ہے۔ جھاڑو سے آنگن کے پتے اکٹھا کر کے آگ لگا کر اُس پر چائے کی کیتلی رکھ دیتی ہوں۔ چائے بنا کر مہمانوں کو پلاتی ہوں۔

رات کا وقت ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ گھر میں باتھ روم نہیں ہے۔ کیفی کو باتھ روم جانا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیفی کی چوکی کہاں رکھوں۔ سب لوگ سو رہے ہیں اُٹھ جائیں گے۔ چوکی آنگن میں رکھتی ہوں۔ لالٹین ہاتھ میں لے کر کیفی کو ایک ہاتھ کا سہارا دے کر آنگن میں لاتی ہوں۔ بارش پریشان کر رہی ہے۔ جلدی سے

چھتری لا کے، کیفی کے لیے چھتری پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہوں، خود
بھیگ رہی ہوں۔ چاروں طرف بارش ہے اور اندھیرا، بس ایک مدھم سی
لالٹین جل رہی ہے۔

مجواں میں تب تک نہ آنے جانے کے لیے سڑک تھی نہ بچوں کے لیے اسکول، نہ کوئی اسپتال نہ ڈاک خانہ، نہ ٹیلیفون نہ ٹی.وی۔ ایسا لگتا تھا کہ برسوں سے اِس گاؤں میں کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ کیفی آہستہ آہستہ اِس فیصلے تک پہنچے کہ اب وہ اپنے اِسی گاؤں میں رہیں گے اور اِس کی ترقی کے لیے جو ہو سکے گا کریں گے چاہے راستے میں کتنی ہی دقتیں کیوں نہ آئیں اور پھر وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اُس چھوٹے سے گاؤں کو ایک ماڈل گاؤں بنانے کی کوشش میں لگے رہے اور بڑی حد تک کامیاب رہے۔

پھول پور سے مجواں تک کوئی سڑک نہیں تھی۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ گاؤں میں سب سے پہلے سڑک بنی چاہیے۔ سڑک نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگوں کو بھی ایک ڈولی میں بیٹھ کر آنا پڑا تھا۔ پتہ نہیں اُس سڑک کو بنانے میں اُنھیں کتنی دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ میں تو ایک نوکر کو کیفی کے پاس چھوڑ کر بمبئی چلی گئی۔ مجھے پتہ چلا کہ سڑک کے لیے لوگ اپنی زمین دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اُس وقت وی پی سنگھ یو پی کے چیف منسٹر تھے۔ اُنھوں نے بھی پوری مدد کی لیکن مشکلیں بھی پیش آتی رہیں۔ ایک دفعہ تو سڑک کے لیے زمین کھودتے ہوئے شنکر بھگوان کی مورتی نکل آئی۔ وی پی سنگھ نے کہا ''کیفی صاحب! اِس وقت تو آپ بمبئی چلے جائیں۔ یہ بھگوان جس طرح آئے ہیں ویسے ہی واپس چلے جائیں گے۔ ورنہ ہندو مسلم فساد کا خدشہ ہے۔'' اِس طرح سڑک بننے میں کئی برس لگ گئے۔ بہر حال سڑک بن گئی۔ وہ

سڑک اب کیفی اعظمی روڈ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اب کیفی کو اسکول بنانے کی فکر ہوئی۔ اسکول کے لیے زمین ضروری تھی۔سرکاری زمین پر تو گاؤں والوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔گوبر کے اُپلوں کے ڈھیر لگا رکھے تھے۔اُن کے پاس سے زمین لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔کیفی اُس وقت کسی سرکاری افسر سے ملے اور اُنھیں آمادہ کیا کہ وہ زمین کی پھر سے پیمائش کریں جو بیس سال میں ایک بار ہوتی ہے۔ابھی صرف سترہ برس ہوئے تھے لیکن کیفی کے کہنے سے گاؤں کی زمین کی پیمائش شروع ہوگئی اِس طرح بہت ساری زمین ناجائز قبضوں سے نکل آئی۔ کچھ کمہار اپنے اُپلے جنھیں اُن کی زبان میں کنڈے کہا جاتا ہے، سرکاری زمین سے اُٹھانے کو تیار نہیں تھے۔کیفی نے اُن میں سے ایک کو بلایا اور کہا: ''ہری لال، کل دس بجے تک وہاں سے کنڈے ہٹ جانے چاہئیں۔'' اُن کی آواز میں اتنی طاقت تھی کہ وہ بڑ بڑاتا ہوا چلا گیا مگر کنڈے ہٹ گئے۔ اسکول کی بنیاد پڑنے لگی۔گاؤں کے کئی لوگ کہنے لگے کہ کیفی صاحب ہم سے زمین چھین کر خود اپنے بچوں کے لیے اسکول بنوا رہے ہیں۔ ہمارے یہاں کام کرنے والا کسان، سیتا رام اُنھیں سمجھاتا ''کیفی صاحب کے بچے تو اتنے بڑے ہوگئے ہیں۔ کب کا اپنی پڑھائی لکھائی ختم کر چکے ہیں۔ وہ یہاں پڑھنے کے لیے کیوں آئیں گے؟ یہ انتظام تو اپنے گاؤں کے بچوں کے لیے ہورہا ہے۔'' شروع شروع میں اسکول صرف چوتھی جماعت تک کھلا۔ٹیچر بھی مل گئے۔ بچے خوشی خوشی اسکول جانے لگے۔ پڑھائی شروع ہوگئی۔وہی ہری لال جو اسکول کے نام کا دشمن تھا، کچھ شرمندہ سا،مسکراتا ہوا آیا اور کہنے لگا ''بھیا جون اسکول بنائن ہیں۔ ہواں اب ہمری پوتییو جات ہے۔آج سبیرے سبیرے بال جھاڑت رہی، کپڑوا بدل کے تیار ہوت

رہی۔ کہت رہی 'دادا ہمے پڑھے کا ہے۔' آج وہی اسکول میٹرک تک کا ہے اور وہاں مجواں ہی نہیں دوسرے گاؤں کے بچے بھی آتے ہیں۔ ایک دن کیفی نے بڑے پیار سے، بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا ''اب ہمیں اپنا گھر مجواں میں بنالینا چاہیے۔ کب تک کسی اور کے گھر میں رہیں گے۔ میں نے ایک کانٹریکٹر حسنین بھائی سے بات بھی کرلی ہے۔ وہ یہیں قریب کے قصبے مائل کے رہنے والے ہیں۔ بمبئی میں کنسٹرکشن کا کام کرتے ہیں۔ وہ تمہاری پسند کا گھر بنادیں گے۔ یہ کہہ کر بیس پچیس ہزار روپے جو اُن کے پاس تھے، مجھے دیے۔ اُن دنوں شبانہ کا کام فلموں میں پورے زور و شور سے چل رہا تھا اور میں بمبئی میں بے حد آرام کی زندگی گزار رہی تھی۔ ویسے بھی میں ہمیشہ سے شہر کی رہنے والی تھی۔ گاؤں میں رہنے کے تصور سے جیسے میرا دم نکل گیا، لیکن میں جان گئی تھی کہ کیفی اپنا ارادہ بدلنے والے نہیں ہیں۔ کیا کرتی، مجبوراً راضی ہوگئی۔ حسنین بھائی سے مل کر گھر کا نقشہ تیار کیا اور مکان بنتا شروع ہوگیا۔ شبانہ نے مجھ سے کہا: ''می، میرے ابّا جیسا گھر چاہیں، بنوادیجیے۔ پیسوں کی فکر نہ کیجیے۔ اگر اُنھیں اِسی میں خوشی ملتی ہے تو یہی سہی۔''

تقریباً ایک سال میں گھر مکمل ہوا۔ میں نے ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم بنوائے تھے۔ مجواں کے لوگ ٹھٹ کے ٹھٹ دیکھنے آتے اور کہتے: ''ارے دیا رے دیا، کیفی چچا کے گھر میں تو سنڈاس ہی سنڈاس۔'' اور ہنستے ہوئے باہر نکل جاتے۔ کیفی نے مجھ سے کہا تھا کہ گھر میں ایک بڑا ہال ہونا ضروری ہے تاکہ میرے گاؤں کے لوگ ٹی. وی. دیکھنے کے لیے آسکیں۔ میں نے گھر کے نقشے میں خاص طور سے ایک بڑا ہال رکھوایا تھا۔ جب بجلی آتی تو گاؤں کے لوگ جوق در جوق

بھاگے بھاگے آتے اور حیرت سے ٹی.وی. دیکھتے۔کوئی چلاّ کر کہتا، ''وہ دیکھو ایک منئی (آدمی) جات ہے۔'' پھر کیفی نے جنریٹر بھی خرید لیا۔ بجلی چلی جاتی تو جنریٹر چلنے لگتا اور ٹی .وی بند نہیں ہوتا۔ ہال میں رش کا یہ عالم ہوتا کہ پیر رکھنے کی جگہ نہ رہتی۔گاؤں کے بچے بے حد میلے کچیلے ہوتے تھے۔ اُن کے کپڑوں سے بُو آتی تھی۔ لگتا تھا نہ جانے کب کے نہائے نہیں ہیں۔میں نے اُنھیں صاف ستھرا رہنے کی عادت ڈالنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ اُن سے کہا کہ جو بچہ بھی ٹی.وی. دیکھنا چاہتا ہے، اُسے نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر آنا ہوگا۔ٹی .وی. دیکھنے کے شوق میں بچوں نے روز نہانا شروع کر دیا۔

جب کیفی نے گھر کے لیے گوبر گیس کا انتظام کیا تو گاؤں والے اپنے جانوروں کا گوبر کچھ دن تو ہمیں دیتے رہے۔ پھر آنا کانی کرنے لگے۔ اُن کو چولہا جلانے کے لیے اُپلے بھی تو چاہیے تھے۔ کیفی فوراً سمجھ گئے۔ اعظم گڑھ گئے اور وہاں سے گیس کا چولہا اور سلینڈر لے آئے۔ پریشر کُوکر میں دلّی سے لے آئی تھی۔ پریشر کُوکر کی سیٹی سن کر عورتیں بھاگی بھاگی میرے گھر آجاتیں اور کہتیں، ''اے چچی، اِی تو سیٹی بجت ہی۔ ریل گاڑی آوت ہے کا؟'' اور منہ میں ساڑی کا پلّو ٹھونس کر ہنستی ہوئی چلی جاتیں۔ اُنھوں نے کبھی پریشر کُوکر نہیں دیکھا تھا۔ غرض یہ کہ اُن کے لیے یہ معمولی چیزیں بھی ایک نیا تجربہ تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اُن عورتوں کو پریشر کُوکر دکھا کے سمجھایا کہ اِس میں ریل گاڑی کی سیٹی کیوں بجتی ہے تو وہ کیسے حیرت سے منہ کھولے سن رہی تھیں۔ اِسی طرح میں اُنھیں ہر چیز تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔ بہت ہی پچھڑا ہوا گاؤں تھا۔ گاؤں میں زیادہ تر گھر تو کمہاروں کے تھے۔ شیعہ مسلمانوں کے صرف چار گھر تھے۔ اِن

گھروں میں باقاعدگی سے مجلسیں ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں۔ بہر حال اب مجواں میں ہمارا اپنا گھر تھا۔ جسے میں نے جانکی کُٹیر ہی کی طرح سجایا اور ہم باقاعدہ مجواں میں رہنے لگے۔

گاؤں کے دن رات

(صبح کے پانچ بجے ہیں۔ میری آنکھ کھل گئی۔ بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی سہانی آواز کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ ٹن ٹن ٹن، کسان سردیوں میں معمولی پھٹے پرانے گُچھے، سر اور کنپٹیوں پر لپیٹے اپنے بیلوں کو کھیتوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کہیں کہیں الاؤ جل رہے ہیں۔ کچھ لوگ آگ تاپ رہے ہیں۔ میں کیفی کو اُٹھاتی ہوں۔ خود گرم کپڑے پہن کر باہر سیتا رام کو پکارتی ہوں: ''سیتا رام آگ جلاؤ، ہم باہر چائے پئیں گے۔)

مجھے گھر سجانے کا جتنا شوق ہے اُس سے زیادہ کیفی کو باغبانی کا تھا۔ گاؤں میں دوسرے کام کرنے کے ساتھ ساتھ پھول پودے لگوانے کا سلسلہ بھی چلتا رہتا۔ ہمارا مالی سیتارام گاؤں کا کسان تھا۔ اُس نے اپنے صاحب کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کے پھولوں اور پودوں سے باغیچے کو جنت نشان بنا دیا تھا۔

میرا روز کا معمول تھا کہ صبح سویرے کھیتوں میں چہل قدمی کے لیے نکل جاتی۔ واپس آ کر ایک رنگین ڈلیا میں موتیا کے پھول توڑ کر جمع کرتی، پھر آم کے درخت کے نیچے سفید چبوترے پر جہاں گوپال کرسیاں اور ٹیبل بچھا دیتا، میز پر اپنے

پھولوں کی ڈلیا رکھ دیتی۔ کیفی پہلے ہی سے وہاں میرے انتظار میں ہوتے تھے۔ اتنے میں گوپال ٹرالی میں چائے اور بسکٹ لے آتا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے آہستہ آہستہ چائے کے شوق میں جمع ہونے لگتے۔ میں سب کو چائے پلاتی۔ اِس طرح ہماری صبح ہوتی تھی۔

ایک دن بسکٹ ختم ہوگئے۔ میں نے ایک بڑے میاں کوصرف چائے دی۔وہ بے چینی سے بولے :''اور بسکٹوا؟'' مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''چاچا بسکٹ ختم ہو گئے ہیں۔ اعظم گڑھ جائیں گے تو لے آئیں گے۔''

روز صبح لان میں چائے پیتے ہوئے کیفی جب سامنے راستے پر لڑکیوں کو یونیفارم پہنے اسکول جاتے دیکھتے تو خوشی سے اُن کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے ''مجھے یہ دیکھ کر خاص طور سے خوشی ہوتی ہے کہ شیعہ گھرانوں کی وہ لڑکیاں جنھیں کل تک دروازے سے باہر جھانکنا بھی نصیب نہیں تھا آج یونیفارم پہنے اسکول جارہی ہیں۔''

صبح کی چائے کے بعد میں باورچی خانے میں مصروف ہوجاتی اور کیفی لکھنے پڑھنے میں۔ کوئی گیارہ بجے شبّر بھیا، صفدر بھیا اور مہدی بھیا، یہ تینوں کیفی کے دُور کے رشتے دار تھے اور عمر میں کیفی سے بڑے، تینوں لگ بھگ اسّی برس یا شاید اُس سے کچھ زیادہ ہی کے ہوں گے مگر اِس عمر میں بھی تاش کا شوق تھا، ورانڈے میں جمع ہوتے، تاش کے پتے نکالے جاتے، اور 'سات ہاتھ' کھیل شروع ہوجاتا۔کیفی تو پہلے ہی سے وہیں کرسی پر بیٹھے ہوتے، وہ بھی شریک ہو جاتے۔ اگر کبھی کوئی غیر حاضر ہوتا تو شبّر بھیا مجھے آواز دیتے ''دلہن آئے جاؤ، ایک ٹھو آدمی کی کمی ہے۔'' میں بھی خوشی خوشی شامل ہوجاتی۔ میں دیکھتی تھی کہ تاش میں بوڑھے

خوب چیٹنگ کرتے ہیں اور کیفی اُن سے بھی زیادہ۔ یہ محفل ایک بجے تک چلتی پھر سب کھانا کھانے چلے جاتے۔ ہم دونوں بھی کھانا کھا کر سوجاتے تھے۔

چار بجے سے پھر مصروفیت شروع ہوجاتی۔ کبھی DM (District Magistrate) آنے والے ہیں کبھی SSP (Senior Superintendent of Police) ۔ کیفی کو گاؤں کے کام کے سلسلے میں انھیں لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اِن کی خاطر داری کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا۔ ہمارا باورچی جسے کیفی بارہ بنکی سے لے کر آئے تھے، بہت تجربہ کار تھا۔ اُسے تقریباً سب طرح کی چیزیں پکانی آتی تھیں۔ شام کے لیے سموسے، پکوڑے وغیرہ بناتا تھا۔ مٹھائی پھول پور سے آجاتی۔ DM اور اُن کے ایک دو ساتھی تو بہت کم کھاتے لیکن اُن کی حفاظت کے لیے دو جیپ بھر کر جو سپاہی آتے تھے وہ خوب ڈٹ کر کھاتے اور کبھی کبھی جیبوں میں بھی بھر لیتے تھے۔

کیفی اُن سے اپنے گاؤں کی ضرورتوں کا ذکر کرتے یا کسی نہ کسی کی نوکری کے لیے کہتے۔ اکثر وہ لوگ یہ کام کر دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی نہ کرنے کے لیے کوئی بہانہ بھی بنادیتے تھے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد رات کو میرے کمرے میں گاؤں کی برقع پوش عورتوں کا تانتا بندھ جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں چلتیں یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہوجاتا۔ سامنے ٹی وی بھی چلتا رہتا۔ وہاں بجلی تو بہت کم آتی تھی لیکن جنریٹر کی وجہ سے گھر میں بجلی کا مسئلہ نہیں تھا۔ بلب جلتے رہتے۔ گھر میں چاروں طرف روشنی رہتی۔

جب سرسوں پھولتی تو سارا گاؤں پیلے رنگ کے پھولوں سے زعفران زار نظر آتا تھا۔ جدھر نظر دوڑاؤ پیلے پیلے پھول۔ یوں لگتا جیسے کسی حسینہ نے اپنا دوپٹہ پیلے

رنگ میں رنگ کے پھیلا دیا ہو۔

ہمارے گاؤں مجواں کی راتیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ چاروں طرف جگنو اُڑتے رہتے ہیں۔ جب چاندنی راتیں ہوتیں تو سماں اور بھی خوبصورت ہو جاتا ہے۔گاؤں تو بہت جلد سو جاتا ہے لیکن اُس کی خاموشی ماحول کو اور زیادہ پر کشش بنا دیتی ہے۔

مجھے یاد ہے ہمارے پلنگ باہر لان میں بچھا دیے جاتے تھے۔ میں کوئی کلاسیکل گانا لگا دیتی۔ کیفی اپنا گلاس لے کر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو جاتے۔ کبھی میری فرمائش پر کوئی نظم یا غزل سناتے۔ ان ہی دنوں کیفی نے ایک غزل کہی تھی جس کے ہر شعر میں اُن کے گاؤں کی تصویر تھی۔ مجھے مطلع یاد ہے:

مہک خلوص کی اس صندلیں غبار میں ہے
محبت آج بھی زندہ مرے دیار میں ہے

پتہ نہیں یہ غزل کہاں کھو گئی۔

گاؤں کی زیادہ تر آبادی کسانوں کی تھی۔ یہ وہ کسان تھے جو پہلے کمہار کا کام بھی کیا کرتے تھے لیکن بعد میں اُنھوں نے کمہار کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اسکول بن جانے کی وجہ سے اُن کے بچے بھی اسکول جانے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ آس پاس کے گاؤں کے بچے بھی اسکول آنے لگے اور بچوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ زیادہ ٹیچروں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اِس لیے مزید ٹیچروں کا تقرر کیا گیا۔ اب کیفی کو فکر ہوئی کہ اسکول میٹرک تک ہو جائے۔ اُس زمانے میں ملائم سنگھ یادو یو پی کے چیف منسٹر تھے اور کچھ دن پہلے شبانہ کو فرانس کے صدر Mitterand کے ہاتھوں مدر تھریسا کے ساتھ انٹرنیشنل ہیومن رائٹس ایوارڈ ملا تھا۔ ملائم سنگھ یادو نے طے کیا ''ہم شبانہ کو

اودھ رتن ایوارڈ دیں گے اور یہ تقریب شبانہ کے آبائی گاؤں مجواں میں ہی ہوگی۔'' چنانچہ گاؤں میں ملائم سنگھ یادو کے استقبال کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مقررہ دن پر ملائم سنگھ یادو، یو. پی .کے گورنر موتی لال وہرا کے ساتھ ہیلی کوپٹر میں آئے۔ مجواں میں پہلی بار ہیلی کاپٹر اُترا تھا۔ تمام گاؤں والے حیرت اور خوشی سے دیوانے ہورہے تھے اور بار بار اُسے دیکھ رہے تھے۔ میں گاؤں میں بھی ڈنر سیٹ، کانچ کے گلاس، دریاں، چادریں وغیرہ کا انتظام رکھتی تھی۔ میں نے گھر کودلہن کی طرح سجا دیا تھا۔ باورچی اعظم گڑھ سے آئے تھے، وتج اور نان وتج دونوں طرح کا کھانا تیار کیا گیا۔ دوپہر میں چیف منسٹر اور گورنر صاحب ہمارے گھر آئے۔ اُن دونوں نے تو کھانا نہیں کھایا لیکن سبھی گاؤں والوں کی دعوت ہوگئی۔ اُن دونوں نے صرف چائے پی۔ وہیں سے اُس پنڈال میں گئے جہاں اسٹیج بنایا گیا تھا۔ گاؤں کی لڑکیوں نے اُن کے آنے کی خوشی میں پوربی زبان میں استقبالیہ گیت گائے۔ گاؤں دیکھ کر ملائم سنگھ یادو بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے بہت اچھی تقریر بھی کی۔ پھر شبانہ نے اپنی تقریر میں کہا، ''ہماری مانگیں تو بہت ساری ہیں لیکن ہماری سب سے بڑی مانگ یہ ہے کہ ہم یہاں لڑکیوں کے لیے میٹرک تک اسکول چاہتے ہیں اور پھر اُس کے بعد ایک ڈگری کالج۔ اِس کے لیے ہمیں گورنمنٹ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' فوراً ہی ملائم سنگھ یادو اُٹھے اور اُنہوں نے پچیس لاکھ روپوں کا وعدہ کیا اور کہا، ''ہم سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ اتنے چھوٹے سے گاؤں میں اتنا روپیہ کیوں دیا گیا، لیکن ہم جواب دینے کے لیے تیار ہیں''۔ خوشی سے سارا گاؤں تالیاں بجانے لگا اور پورے گاؤں میں ہنگامہ ہوگیا۔ غرض کہ وہ دن بہت اچھا گزرا اور کیفی کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ افسوس کہ وہ پچیس لاکھ روپے کیفی کے گاؤں کو نہیں ملے۔

قریب کے قصبے امباری والے اپنے کالج کے لیے لے اُڑے۔ وجہ یہ تھی کہ میں بیمار ہوگئی تھی۔ مجھے اور کیفی کو بمبئی واپس آنا پڑا۔ کیفی کی غیر موجودگی کا اُن لوگوں نے فائدہ اُٹھایا۔

کیفی نے ہمت نہیں ہاری۔ ہم بمبئی سے مجواں واپس آگئے تھے۔اب ہم نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور کو بھی بمبئی سے بلا لیا تھا تاکہ کیفی آسانی سے اعظم گڑھ، لکھنو وغیرہ جا سکیں۔ یہ ہر آفیسر سے ملتے اور گاؤں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے۔ حتیٰ کہ اپنی ان تھک کوششوں سے اُنھوں نے لڑکیوں کے لیے میٹرک تک اسکول بنا کر ہی دم لیا۔ ایک سوسائٹی بھی قائم کی 'مجواں ویلفر سوسائٹی'۔لڑکیوں کے لیے سلائی کڑھائی سیکھنے کا انتظام بھی کیا۔ اپنی زمین پر اُن کے لیے ایک ٹریننگ سینٹر بنوا دیا اور پھر رُونا بنر جی کے پاس لکھنو پہنچ گئے۔ رونا نے لکھنو میں چکن کا کام سکھانے کی ایک تنظیم بنائی ہے SEWA۔ کیفی نے رُونا سے کہا ''ایک ٹیچر تم میرے گاؤں بھیجو تاکہ وہ میرے گاؤں کی لڑکیوں کو لکھنو کا چکن ورک سکھائے۔ اُن سے تم بھی کام لو اور اُن کی مزدوری دو۔''

رُونا نے مجھے بتایا'' شوکت آپا۔۔کیفی صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے اور جب تک میں نے ہاں نہیں کی، میرا ہاتھ نہیں چھوڑا''۔۔ آخر رُونا نے اپنی ایک اچھی ٹیچر کو مجواں بھیجا۔ اُس نے لڑکیوں کو لکھنو کے چکن کا کام سکھایا۔ اب لڑکیاں گھر بیٹھے بارہ پندرہ سو روپے ماہانہ کما لیتی ہیں۔ جب شبانہ ایم. پی. بنی (ہر ایم. پی کو سرکار سے ہر سال دو کروڑ روپے اپنے حلقے میں فلاح و بہبودی کے کام کے لیے دیے جاتے ہیں) شبانہ کو کسی حلقے سے چُنا نہیں گیا تھا بلکہ صدرِ جمہوریہ نے نامزد کیا تھا۔ اُسے اپنے لیے صرف ایک حلقے کا انتخاب کرنا تھا۔ مگر اُس نے مستقل

ایک سال حکومت سے جھگڑ کر یہ قانون بنوایا کہ صدر کے نامزد کیے ہوئے ایم. پی. فلاح و بہبود کے لیے یہ رقم ہندوستان میں کہیں بھی خرچ کر سکتے ہیں۔ اِس طرح اُس نے ہر سال ملنے والی اس رقم سے بمبئی کے علاوہ اعظم گڑھ، جونپور اور لکھنو میں بھی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے۔ مجواں میں کنور ندی پر ایک پُل بنوایا۔ اِس طرح کم سے کم پچیس گاؤں کے لوگ جو برسات میں ہائے وے تک نہیں پہنچ سکتے تھے، اب آنے جانے لگے۔ اعظم گڑھ میں شبلی کالج ہے۔ یہ مولانا شبلی نعمانی کا بنوایا ہوا ہے۔ لڑکوں کے ساتھ یہاں لڑکیاں بھی بڑی تعداد میں پڑھتی ہیں۔ اُن کے ہاسٹل کا مسئلہ تھا۔ شبانہ نے اپنے ایم. پی فنڈ سے پیسہ دے کر یہاں گرلز ہاسٹل بنوایا جس سے بہت سی بچیوں کو بڑی سہولت ہوگئی۔ اعظم گڑھ والوں نے بھی شبانہ کی خدمات کا اعتراف یوں کیا کہ ایک سڑک کا نام شبانہ اعظمی روڈ رکھ دیا۔ اب ایک ہی ضلع میں ایک سڑک بیٹی کے نام پر ہے اور ایک سڑک باپ کے نام پر۔

کیفی کی عادت تھی کہ ایک کام ختم ہوتے ہی دوسرے کے بارے میں سوچنے لگتے تھے۔ ایک دن آہستہ سے مجھ سے کہا ''میں یہاں کمپیوٹر کلاس بھی کھولنا چاہتا ہوں تاکہ میرے بچوں کو نوکری ملنے میں سہولت ہوجائے''۔

میں ہنس پڑی: ''یہاں جہاں بجلی صرف دو تین دن میں ایک دو گھنٹے کے لیے آتی ہے!''

وہ ایک دم خاموش ہوگئے۔ ویسے بھی کیفی بہت کم گو تھے۔ کچھ دنوں کے لیے میں بمبئی آگئی تھی۔ ایک دن پتہ چلا کہ کمپیوٹر کلاس کے کمرے بھی بن گئے ہیں۔ جس کے لیے سماج وادی پارٹی کے لیڈر امر سنگھ نے اپنے فنڈ سے سات لاکھ روپے دیے تھے۔ شبانہ نے بھی اپنے فنڈ سے دس کمپیوٹر دلوادیے تھے۔ کیفی نے بڑی

مشکلوں سے کمپیوٹر کلاس کے لیے ایسے ٹیچر بھی ڈھونڈ لیے جو کہ جونپور سے آ کر گاؤں میں رہنے کے لیے تیار ہو گئے۔کمپیوٹر کلاس میں دو سو بچے شریک بھی ہو گئے ہیں۔

یہ تمام باتیں مجھے کمپیوٹر کلاس کے لیے نریش گوئل کے بھیجے ہوئے ائر کنڈیشنر کو دیکھ کر یاد آ گئی تھیں۔ میں نے عزت اور احترام سے اپنے بیمار کیفی کے ماتھے کو پیار کر لیا اور اپنی طنزیہ مسکراہٹ پر شرمندہ ہو گئی۔ وہ اپنے گاؤں مجواں کو کہاں سے کہاں تک لے آئے تھے۔

نریش گوئل چونکہ شبانہ اور جاوید کے دوست ہیں اور کیفی کو بہت چاہتے ہیں، اُن سے کیفی نے ائیر کنڈیشنر مانگ لیا اور آج وہ بھی آ گیا۔ جنریٹر کا انتظام کیفی نے پہلے ہی کر دیا تھا کہ جب بجلی چلی جائے تو ائر کنڈیشنر جنریٹر سے چلے۔ میں کیفی کی ہمت اور طاقت کی قائل ہو گئی۔

کیفی کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ اُن کا مقصدِ حیات بہت بلند تھا جس پر وہ مرتے دم تک قائم رہے۔ عام انسانوں کا خیال، انسانیت سے پیار، کمیونزم پر اٹل اعتماد، جو بات دل میں وہی زبان پر۔ آخری وقت تک وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔ بے حد مہذب اور گریس فُل انسان تھے۔ میری نگاہوں سے تو کیفی جیسا شاندار انسان نہیں گزرا۔ جاوید اختر نے کیفی پر جو نظم کہی ہے وہ سو فی صد درست ہے۔

عجیب آدمی تھا وہ

عجیب آدمی تھا وہ
محبتوں کا گیت تھا بغاوتوں کا راگ تھا
کبھی وہ صرف پھول تھا کبھی وہ صرف آگ تھا
عجیب آدمی تھا وہ
وہ مفلسوں سے کہتا تھا
کہ دن بدل بھی سکتے ہیں
وہ جابروں سے کہتا تھا
تمہارے سر پہ سونے کے جو تاج ہیں
کبھی پگھل بھی سکتے ہیں
وہ بندشوں سے کہتا تھا
میں تم کو توڑ سکتا ہوں
سہولتوں سے کہتا تھا
میں تم کو چھوڑ سکتا ہوں
ہواؤں سے وہ کہتا تھا
میں تم کو موڑ سکتا ہوں
وہ خواب سے یہ کہتا تھا
کہ تجھ کو سچ کروں گا میں
وہ آرزو سے کہتا تھا

میں تیرا ہمسفر ہوں،
تیرے ساتھ ہی چلوں گا میں
تُو چاہے جتنی دور بھی بنا لے اپنی منزلیں
کبھی نہیں تھکوں گا میں
وہ زندگی سے کہتا تھا
کہ تجھ کو میں سجاؤں گا
تُو مجھ سے چاند مانگ لے
میں چاند لے کے آؤں گا
وہ آدمی سے کہتا تھا
کہ آدمی سے پیار کر
اُجڑ رہی ہے یہ زمیں
کچھ اِس کا اب سنگار کر
عجیب آدمی تھا وہ
وہ زندگی کے سارے غم تمام دکھ ہر اک ستم سے کہتا تھا
میں تم سے جیت جاؤں گا
کہ تم کو تو مٹا ہی دے گا ایک روز آدمی
بُھلا ہی دے گا یہ جہاں
مری الگ ہے داستاں

وہ آنکھیں جن میں خواب ہیں
وہ دل ہے جن میں آرزو
وہ بازو جن میں ہے سکت
وہ ہونٹ جن پہ لفظ ہیں
رہوں گا اِن کے درمیاں
کہ جب میں بیت جاؤں گا
عجیب آدمی تھا وہ

20 جولائی 2002

کسی بھی قسم کا انقلاب لانے کے لیے انسان میں ارادے کی مضبوطی کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ کاش کیفی کچھ دن اور جیتے تو نہ جانے اور کتنے کام کر جاتے۔ مجواں میں لڑکیوں کے لیے ڈگری کالج بنانا چاہتے تھے۔ اگر اُنھیں کچھ اور مہلت ملی ہوتی تو مجھے یقین ہے اُن کا یہ خواب بھی پورا ہو جاتا۔ فالج کے حملے کے بعد اس طرح مسلسل کام کرتے رہنا نہ صرف حیرت انگیز بات تھی بلکہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ سردار بھائی اکثر کہا کرتے تھے ''کیفی نے فالج کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے بعد یہ بیماری کسی شاعر پر تو نازل ہونے کی جرأت نہیں کرے گی۔''

مشاعرے کے لیے دنیا کے کسی کونے سے بھی اُنھیں بلاوا آجاتا تو وہ فوراً تیار ہو جاتے۔ میں اُن کے ساتھ رہتی۔ بیماری کبھی اُن کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ اُن کا مقصدِ حیات تھا اِس دنیا کو بدل دینا۔ غریبی، بھوک اور جہالت کو مٹا

دینا لیکن جب یہ دیکھا کہ پوری دنیا کو بدل دینے میں تو بہت دیر لگے گی تو وہ اپنے گاؤں کی طرف مڑ گئے اور واقعی وہاں کی کایا پلٹ کر رکھدی۔

کیفی اپنی بیماری اور صحت کی فکر کیے بغیر اپنے کام میں یوں ہی لگے رہے چنانچہ صحت کب تک ساتھ دیتی۔ طبیعت خراب رہنے لگی تھی، لیکن وہ کبھی اُس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ میں ڈاکٹر کو بلا کر دکھاتی۔ دوا منہ میں ڈالتی، کچھ دنوں کے لیے کچھ ٹھیک ہو جاتے لیکن پھر وہی حالت۔ کھانسی آتی رہتی۔ ڈاکٹر ٹھنڈی چیزوں کے لیے منع کر دیتے لیکن ہمیشہ ٹھنڈا پانی پیتے تھے۔ بے انتہا محنت، ہر جگہ کا کھانا پینا۔ چنانچہ صحت بہت خراب رہنے لگی۔

14 جنوری 2002 کو شبانہ کیفی کی سالگرہ منانے مجواں آئی (کیفی کی تاریخ پیدائش کسی کو یاد نہیں۔ ایک دن اُن کے دوست، ڈاکیومنٹری فلم میکر سُکھ دیو، نے یوں ہی طے کر دیا کہ کیفی چودہ جنوری کو پیدا ہوئے تھے۔ تب سے چودہ جنوری کو کیفی کی سالگرہ کا دن مان لیا گیا۔) شبانہ جب بھی گاؤں میں آتی تھی تو ہمارے گھر پر جیسے میلا سا لگ جاتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں اور قصبات کے لوگ بھی اپنے اپنے مسائل لے کر اُس سے ملنے آتے تھے۔ اِس بار بھی وہی منظر تھا۔ صبح سے سیکڑوں لوگ شبانہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ کسی کو نوکری چاہیے تھی، کسی کو سفارش نامہ، کوئی سڑک بنوانا چاہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ شبانہ بغیر کچھ کھائے صبح سے برآمدے میں بیٹھی لوگوں کے مسائل سن رہی تھی۔ چار بج رہے تھے۔ کیفی نے کسی طرح اپنے آپ کو بستر سے اُٹھایا اور مجھ سے کہا "مجھے کچھ پیسے دے دو۔" میں نے پوچھا "کس لیے؟" تو بولے، "دے دو، بحث مت کرو۔" میں نے سو روپے اُن کے ہاتھ میں تھما دیے۔ کیفی نے ڈرائیور کو پکارا اور گوپال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر

نکل گئے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کدھر گئے ہیں اور کسی میں پوچھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے، شبانہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا ''صبح سے میرے گاؤں والے میری چڑیا کا بھیجا چاٹ رہے ہیں۔ دیکھو میں تمھاری پسند کے سموسے بنوا کے لایا ہوں۔ گرم گرم ہیں۔ اِنھیں کھا لو، پھر گاؤں والوں سے نپٹنا۔'' خوشی خوشی شبانہ سموسے چٹ کر گئی، شاید ایک آدھ کیفی کے منہ میں بھی ڈال دیا۔ یہ آخری بار تھا کہ کیفی اپنے بستر سے خود اُٹھ کے کہیں باہر گئے تھے۔

کیفی بہت زندہ دل تھے اور اُن کی یہ خوبی مرتے دم تک قائم رہی۔ ایک مرتبہ بمبئی میں اُن کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا اور آپریشن کے بعد جب وہ کمرے میں لائے گئے تو وہ ہانپنے کے انداز میں منہ سے سانس لے رہے تھے۔ بار بار ڈاکٹر کہہ رہے تھے ''کیفی صاحب ناک سے سانس لیجیے۔ منہ بند رکھیے۔'' شبانہ نے جھک کر اُن کے کان میں کہا ''ابا اپنا منہ بند رکھیے۔'' کیفی آہستہ سے بولے ''منہ میرا نہیں، بال ٹھاکرے کا بند کرواؤ۔''

ایک بار مجواں میں کئی لوگ بیٹھے تھے۔ کسی نے بتایا کہ پشاور اور کراچی میں ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں کہ طالبان نے وہاں شادیاں کیں اور کچھ دن بعد اپنی بیویوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اِسی طرح اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ حالانکہ اُن دنوں کیفی کی طبعیت کافی خراب تھی مگر اُس رات ہم لوگ دیر تک جاگے۔ اگلے دن کیفی پر ایسا دورہ پڑا کہ میں گھبرا گئی اور میں نے چلاّ کر کیفی کے بھانجے کو آواز دی؛ ''اختر اختر، کیفی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' ڈاکٹر جب کیفی کو دیکھ چکے اور کیفی تھوڑے سے بہتر ہوئے تو آہستگی سے مجھ سے کہا ''میں طالبان تھوڑے ہی ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔'' مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی سخت بیماری میں بھی اُن کا

sense of humour اپنی جگہ ہے۔

بہرحال کیفی پر اِس طرح دورہ پڑنے سے میں کافی گھبرا گئی تھی۔ میں نے بابا اور جاوید کو فون کیا۔ جاوید نے کہا ''شوکت آپا، آپ گھبرایئے نہیں، آپ اگر کیفی صاحب کو بنارس کے اسپتال میں داخل کرنا چاہتی ہیں تو میں یہیں سے انتظام کر دوں گا اور اگر دلّی لے جانا چاہیں تو اُس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔'' شبانہ اُس وقت گوا میں تھی۔

بابا دوسرے دن ہی پرنا کو لے کر مجواں پہنچ گیا۔ پرنا شبانہ کی سب سے گہری دوست ہے اور بالکل میری بیٹی کی طرح ہے۔ ہر سُکھ دُکھ میں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی۔ اُس نے بابا کو نہیں بتایا کہ اُس کا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے اور اُس پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ اپنے کُرتے کی آستین میں ہاتھ کو چھپا کر فوراً بابا کے ساتھ چل پڑی۔

کیفی کی حالت بہت نازک تھی۔ مجواں سے بنارس کا سفر تین گھنٹے کا ہے۔ ڈی۔ ایم۔ نے ایمبولینس اعظم گڑھ سے فوراً بھجوا دی تھی مگر اُس کی حالت دیکھ کر ہم سب چکرا گئے۔ ایمبولینس کیا تھی بس ایک ٹیمپو تھا جس کے فرش پر اسٹریچر رکھ دیا گیا تھا۔ انتہائی گندی اور بدبودار ایمبولینس تھی۔ پرنا، بابا اور گوپال نے اپنے ہاتھوں سے اُس میں جھاڑو لگائی، بالٹیوں میں پانی لا لا کر اُس میں فینائل ملا کر فرش دھویا۔ پھر کیفی کو اسٹریچر پر لٹایا۔ ہم سب اُن کے اطراف بیٹھے اور ایمبولینس چل پڑی۔ راستہ بہت خراب تھا۔ جب کبھی دھکّا لگتا میرا کلیجہ نکل جاتا اور میں کیفی کی طرف دیکھتی۔ اُن کے منہ سے اُف بھی نہیں نکلی۔ ایسی قوتِ برداشت میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ آج بھی بابا اُسی طرح میری مدد کو آیا تھا جیسے تیس برس پہلے، جب کیفی

پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ہم بنارس کے بابت پور ائر پورٹ پہنچے۔ بابا نے کیفی کو اپنی گود میں اُٹھا کر بڑی مشکل سے ہوائی جہاز کی سیٹ پر بٹھایا۔ بنارس سے دلّی کا ہوائی سفر صرف ایک گھنٹے کا ہے لیکن مجھے لگا جیسے ایک صدی کا سفر ہے۔ میں مسلسل دعائیں مانگتی رہی۔ آخر کار ہم دلّی پہنچے۔ جاوید نے بمبئی سے ڈاکٹر نریش تریہن کو فون کر دیا تھا۔ اُنھوں نے ائیر پورٹ پر ایمبولینس بھجوادی تھی۔ کیفی کو سیدھے ایسکورٹ ہاسپٹل میں داخل کردیا گیا۔ وہاں کیفی icu میں ایک مہینے رہے۔

پھر شبانہ اُنھیں بمبئی لے آئی۔ اتنے میں گجرات کے فسادات شروع ہو گئے۔ گھر میں بستر پر لیٹے کیفی صرف ٹی .وی. دیکھتے رہتے۔ منہ سے بولنے کی طاقت تو اُن میں نہیں رہی تھی لیکن آنکھوں میں بے پناہ درد تھا۔ اپنے پیارے ملک میں ایک بار پھر ہندو مسلم فسادات دیکھ کر وہ لرز گئے۔ شبانہ امرسنگھ، راج ببر اور سیتا رام یچوری کے ساتھ یکم فروری 2002 کو احمد آباد پہنچی۔ نریندر مودی سے فون پر بات کی لیکن اِن لوگوں کو فساد زدہ علاقوں میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ نریندر مودی نے کہا ''اب سب ٹھیک ہے۔ صرف چھٹ پُٹ گھٹنائیں ہورہی ہیں۔'' اور زبردستی اِن سب کو واپس دلّی بھجوادیا۔ اُسی رات کو وہاں نرودا پاٹیا میں پچیس لوگ زندہ جلادیے گئے۔ بمبئی آکر جب یہ واقعہ شبانہ نے کیفی کو سنایا تو کیفی نے شبانہ کو گلے سے لگا لیا اور کہا ''ہمت نہ ہارو اور اپنا کام کرتی رہو۔ ایک دن تو ایسا آئے گا جب یہ پاگل پن ختم ہو جائے گا۔'' بمبئی آنے کے ایک مہینے بعد اُنھیں پھر وہی دورہ پڑا۔ یہ دورہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں انسان کوما میں جا سکتا ہے۔ دونوں بچے گھبرا گئے۔ بابا نے راتوں رات اُنھیں جسلوک ہاسپٹل کے icu میں داخل کروادیا۔ دو

مہینے تک بمبئی کے جتنے بڑے ڈاکٹر تھے وہ اُن کی دیکھ بھال میں لگے رہے۔

اسی دوران ساہتیہ اکادمی نے کیفی کو اُن کی ادبی خدمات پر ساہتیہ اکادمی فیلوشپ ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ایوارڈ دینے کے لیے دہلی سے کئی ادبی شخصیتیں اور دانشور جیسے پروفیسر گوپی چند نارنگ وغیرہ تشریف لائے تھے۔کیفی چونکہ بہت بیمار تھے اس لیے اُنھیں ایوارڈ ہاسپٹل میں ہی دیا گیا۔

کیفی کو اُن کی زندگی میں بھی اور اُن کے بعد بھی لوگوں سے بے پناہ محبت اور عزت ملی ہے۔ پروانچل یونیورسٹی میں کیفی کے نام پر ایک میڈیا سینٹر بنا ہے۔لکھنو میں ایک آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی بنی ہے جو اُن کے نام پر ایک بڑا آڈیٹوریم تعمیر کروا رہی ہے۔ پچھلے دنوں دہلی میں دہلی پبلک اسکول کے پاس ایک سڑک کا نام کیفی اعظمی روڈ رکھا گیا۔کانگریس کے ایم.ایل.اے.اشوک سنگھ اوران کی بیوی برکھا جو ایم.ایل.اے.بھی ہیں اور شاعرہ بھی،کیفی کے چہیتے تھے۔دونوں میاں بیوی چاہ رہے تھے کہ کسی طرح ڈی.پی.ایس.اسکول کے آس پاس جھگی جھونپڑی میں رہنے والے بچے بھی اس اسکول میں پڑھ سکیں۔کیفی نے اس کوشش میں دونوں کی مدد کی۔یہ بے حد خوشی کی بات ہے کہ آج ایسا ہی ہو رہا ہے۔

ایک دن جب میں کیفی کو دیکھنے کے لیے icu میں داخل ہوئی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بستر پر لیٹے ہوئے کیفی کی آنکھیں بند تھیں اور آنسوؤں سے گیلی تھیں۔ میں نے اُنھیں کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے بھائی کے انتقال اور اپنے پہلے بچے کی موت پر بھی وہ نہیں روئے تھے اور آج تو ڈاکٹروں نے اُنھیں icu سے دوسرے کمرے میں شفٹ ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ بابا میرے

ساتھ تھا، کہنے لگا ''ابا ڈاکٹروں نے آپ کو icu سے شفٹ ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ میں آپ کے لیے ایسا کمرہ لوں گا جس میں ٹی وی ہوگا۔ آپ نیوز بھی دیکھ سکیں گے۔'' کیفی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اتنے میں شور ہوا کہ چیف منسٹر وِلاس راؤ دیشمکھ کیفی صاحب کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ چیف منسٹر کمرے میں داخل ہوئے۔ پھر بھی کیفی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ میں نے اُن کے قریب جا کر کہا: ''وِلاس راؤ صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' اُنھوں نے بند آنکھوں سے صرف اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا دیا جسے وِلاس راؤ صاحب نے پیار سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تھوڑی دیر باتیں کر کے وہ چلے گئے۔ میں نے مڑ کر ڈاکٹر ایچ.جی. دیسائی سے پوچھا، ''ڈاکٹر صاحب یہ ڈپریشن کی وجہ سے تو نہیں رو رہے ہیں۔ کیا اِس کی بھی کوئی دوا ہوگی۔'' وہ مسکرا کر بولے: ''کوئی دوا نہیں، آپ لوگ روز آیا کیجیے، ہنسیے بولیے، یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ کل تو اِن کو دوسرے نارمل کمرے میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔''

مگر میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا تھا۔ ایک انجانے خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے کیفی کے ماتھے پر پیار کر کے کہا: ''کیفی کل سے آپ کے تمام دوست آپ سے ملنے آ سکیں گے۔ میں بھی روز آؤں گی۔ آپ بالکل مایوس نہ ہوں۔''

وہ نہ کچھ بولے، نہ آنکھیں کھولیں۔

دوسرے دن میرا بیٹا بابا صبح آٹھ بجے ہی ہاسپٹل پہنچ گیا اور کمرے میں ابا کو شفٹ کر دیا لیکن وہ کمرہ اُسے پسند نہیں آیا۔ دوسرا ایک بڑا کمرہ جو اُسی دن خالی ہوا تھا وہ مل گیا۔

میں نے بابا کو فون کیا ''بابا میں آجاؤں؟'' بابا نے جواب دیا ''ممی کمرہ بدلنے میں ابا تھک گئے ہیں آپ کل آیئے۔ آج اُنھیں آرام کرنے دیجیے۔'' میں چپ ہو گئی لیکن میرا دل گھبراتا ہی رہا۔

دوسرے دن صبح چھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے فون اُٹھایا۔ اُدھر سے کوئی نہیں بولا میں نے ہلو ہلو کر کے فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اُٹھایا ہلو ہلو کوئی جواب نہیں۔ میں نے ڈانٹا: ''اگر آپ کو بات نہیں کرنی ہے تو آپ خوامخواہ فون کیوں کر رہے ہیں۔'' اور فون رکھ دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے کیفی کا آخری فون تھا۔ وہ فون اُن کی نرس ماریا کر رہی تھی۔ وہ کیفی کے کان کے پاس فون لگائے ہوئے بیٹھی تھی کہ شاید میری آواز سے وہ جی اُٹھیں۔

لیکن جیسے آہستہ آہستہ دیے میں تیل ختم ہونے لگتا ہے اور اُس کی روشنی مدھم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُسی طرح کیفی آہستہ آہستہ بجھتے چلے گئے اور آخر 10 مئی 2002 کی اُس منحوس صبح کو چھ بجے ہمیشہ کے لیے بجھ گئے اور میری زندگی کو ہمیشہ کے لیے گھپ اندھیروں میں چھوڑ گئے۔

اُس دن کا خیال مجھے آج تک ایک زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہا ہے۔ جب کیفی کی میّت ہاسپٹل سے گھر لائی گئی تھی۔ بابا میرے کمرے میں آیا اور کہا ''ممی ابا کو اُن کے کمرے میں لٹا دیا ہے آپ دیکھیں گی؟'' میرے منہ سے نکلا ''ہاں مجھے دیکھنا ہے۔'' میں پلنگ سے اُٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے کیفی کے کمرے میں گئی۔ دھڑکتے دل اور خشک آنکھوں سے اُن کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، غور سے گھورتی رہی۔ ایک بے جان آدمی کو جس کے ساتھ میں نے پچپن سال

گزارے تھے۔ پچپن سال مکمل ہونے میں صرف تیرا دن باقی تھے۔ 23 مئی 1947 سے 10 مئی 2002۔

ہزاروں یادیں، ہزاروں باتیں ذہن میں گھومنے لگیں۔ مجھے لگا جیسے کوئی زہریلا ناگ میری گردن سے لپٹا مجھے ڈس رہا ہے۔ یہ سوال جیسے مجھے ڈنک مار رہے تھے کہ کیا یہ وہی شخص ہے جس پر میں جان چھڑکتی تھی۔ جو میری زندگی تھا، کیا اب یہ مجھ سے کبھی نہیں بولے گا۔ کیا کچھ دیر میں لوگ اِسے میرے پاس سے لے جائیں گے، ہمیشہ کے لیے۔ میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکی۔ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ اس کڑوی حقیقت پر یقین کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

○

کیفی کے بغیر

ہر روز صبح ہوتی ہے چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ کبھی بادل گھر کر آجاتے ہیں کبھی بارش کی پھوہار اندر ورانڈے میں آجاتی ہے۔ روز کی طرح ہمارا ملازم ونود میز پر چائے کی ٹرے لا کر رکھ دیتا ہے لیکن سامنے کی کرسی خالی ہے۔ اُس پر میرے کیفی نہیں ہیں جو میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کی پیالی کے انتظار میں اپنی کمزوری کے باوجود کرسی پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے کانپتے ہاتھ سے پیالی لے کر تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے تھے اور چائے اس طرح پینے لگتے تھے گویا امرت پی رہے ہوں۔

تمام دن میں یہی لمحے میرے سب سے خوبصورت پُرسکون اور طاقت بخش ہوتے تھے۔ ان ہی لمحوں سے متاثر ہو کر کیفی نے ایک نظم کہی تھی،

ایک لمحہ

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا

اور ان میں بھی وہی اک لمحہ

جس میں دو بولتی آنکھیں

چائے کی پیالی سے جب اُٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کے دل میں کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یونہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لیے
غم کی سوغات لیے
گرمیٔ جذبات لیے
کون جانے کہ اِسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں برف پگھلنے ہی لگے

زندگی اُسی طرح چل رہی ہے کیفی مگر تم کہیں کھو گئے ہو۔ گاؤں جاتے تھے تو اُمید رہتی تھی کہ کسی دن آجاؤ گے۔ مجھے یاد ہے وہ نئے سال کی رات۔ گھر میں شور ہنگامہ تھا۔ میں مہمانوں کے لیے انتظام میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی لیکن دل کے کسی کونے میں ایک خواہش جاگ اُٹھی تھی ''کاش کیفی یہاں ہوتے۔'' میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ تم گیٹ سے چھڑی ٹیکتے ہوئے اندر آرہے ہو۔ میں دوڑ کر تم سے لپٹ گئی۔ میں نے تم سے کہا ''ارے واہ تم کیسے آگئے، تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اِس وقت تمہاری کمی مجھے خوش نہیں ہونے دے رہی تھی۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے تمہارا آنا۔ اب صحیح معنوں میں میرا نیا سال ہوگا۔''

تم اُس دن کیسے اچانک آئے تھے کیفی۔ کیا اب ایسا کبھی ممکن نہیں ہوگا کہ تم

اچانک چلے آؤ اور میں حیرت اور خوشی سے تمھیں لپٹ جاؤں لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے اِس کڑوی حقیقت کو قبول کرنا ہی پڑے گا کہ تم کہیں بہت دور چلے گئے ہو جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟
میرے دل پہ جو بوجھ ہے وہ کب ہٹے گا کیفی؟
تمہارے بغیر مجھے کب تک جینا پڑے گا کیفی؟

کیفی میرے شوہر ہی نہیں ایک دوست بھی تھے۔ جنھوں نے کبھی مجھ پر اپنی خواہش نہیں لادی۔ مجھے کبھی وہ کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جسے میں نے پسند نہیں کیا۔ میری مرضی میری خواہش اُنھیں ہمیشہ عزیز تھی۔ میرے لیے ہمیشہ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ میں آگے بڑھوں، میرا نام ہو، میں independent رہوں، لوگ میری تعریف کریں۔

شادی سے پہلے 1947 میں جب اورنگ آباد میں کیفی ہمارے گھر ٹھہرے ہوئے تھے تو میں نے ایک پیپر پر یہ لکھ کر اُن کے سامنے بڑھا دیا تھا کہ "کاش گئے زندگی میں تم میرے ہم سفر ہوتے تو زندگی اس طرح گزر جاتی جیسے پھولوں پر سے نسیمِ سحر کا لطیف جھونکا۔"

مجھے حیرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ یہ پچپن سال کتنی جلد گزر گئے۔ کیفی کا ساتھ میرے لیے اتنے کم دنوں کا تھا۔ اُن کے ساتھ رہنے میں میرا جی نہیں بھرا۔ کاش وہ اور دن میرے ساتھ رہتے۔

گاؤں میں میرے بغیر رہنا اُن کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا لیکن کبھی مجھے مجبور نہیں کیا۔ جب میرا جی چاہا میں اُن کے ساتھ چلی گئی اور گاؤں میں رہی اور

جب جی نہیں چاہا نہیں گئی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میرے نہ رہنے نے اُنھیں بیمار کر دیا۔ پھر بھی اُن کی زبان پر کبھی شکایت نہیں آئی۔ کیفی میں قوتِ برداشت غیر معمولی تھی۔

1976 کی بات ہے۔ لکھنو میں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پاؤں مڑ گیا اور گر پڑے۔ کولھے کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی۔ کیفی کے دوست بھیشم کپور، جو بلٹز کے رپورٹر تھے، ساتھ تھے اُنھوں نے میڈیکل کالج کے ہاسپٹل پہنچا دیا۔ میں بمبئی میں تھی۔ بھیشم کپور نے مجھے فون پر اطلاع دی۔ میں فوراً ہی بائی ایر لکھنؤ پہنچی۔ کیفی کے دوست سید محمد مہدی کو بھی بلا لیا جو دہلی میں رہتے تھے۔ میں نے ہاسپٹل میں دیکھا کہ کئی ڈاکٹر کیفی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ناک اور منہ میں نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ٹیپ سے پیٹ ناپ رہے تھے۔ پیٹ پھولتا جا رہا تھا۔ آنتوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ میں نے اُن کے کان میں آہستہ سے کہا ''کیفی میں آ گئی ہوں، اب تم پریشان مت ہونا۔''

پندرہ بیس منٹوں میں ڈاکٹر گوئل نے کہا کہ ''آپ کے آنے سے اِن میں ایک نئی انرجی آ گئی ہے۔ آنتوں میں آہستہ آہستہ حرکت آ رہی ہے۔ اگر آپ ایک گھنٹہ اور نہ آتیں تو ہمیں اِن کے پیٹ کا آپریشن کرنا پڑتا۔''

مہدی نے مجھ سے کہا کہ ''ڈاکٹروں کی رائے ہے اِنھیں یہیں رکھا جائے، اس حالت میں بمبئی لے جانا بہت مشکل ہوگا۔'' میں راضی ہو گئی۔

کیفی کو ایک چھوٹے سے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا جس میں ایک کچن ایک باتھ روم اور ایک چھوٹا سا آنگن بھی تھا۔ بائیں پیر کی ہڈی بہت بری طرح سے ٹوٹی تھی۔ اُسے ڈاکٹر گوئل نے جس طرح جوڑا یہ اُنھیں کا کمال تھا۔ مگر چونکہ پیر کی

نازک جلد کے لیے پلاسٹر مناسب نہیں تھا اس لیے ٹریکشن میں رکھنا پڑا۔

چار مہینے تک کیفی کا پیر ٹریکشن میں لٹکا رہا۔ میں چار مہینے اُن کے پاس رہی۔ وہ کروٹ تک نہیں لے سکتے تھے۔ لیٹے لیٹے ہر چیز ہوتی تھی۔ میں نے چار مہینے میں ایک دن بھی کیفی کو جھلاتے یا چڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صرف جب صبح ہوتی تو دکھ بھرے لہجے میں اتنا کہتے ''شوکت ۔۔! شکر ہے ایک دن اور گزر گیا۔''

کبھی کہتے اب میں ساگر کا گھوڑا نہیں بن سکوں گا۔ ساگر میرے بھانجے ارشاد کا بیٹا ہے جو اُس وقت دو تین سال کا تھا۔ کیفی اُسے بہت چاہتے تھے۔ میں نے سامنے دیوار پر ساگر، بابا اور شبانہ کی تصویریں لگا دی تھیں تاکہ جب صبح کیفی کی آنکھ کھلے تو وہ اپنے بچوں کی تصویروں کو دیکھ کر خوش ہو جائیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ چار مہینوں میں اُنھوں نے ایک دن بھی اپنی جسمانی تکلیف کا اظہار نہیں کیا لیکن اُس بات پر نظم لکھی جس نے اُن کے دل کو تکلیف پہنچائی تھی۔

محرم کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ میں شیعہ سُنّی فساد ہو گئے۔ میڈیکل کالج کے ہاسپٹل میں روز ایک دو لاشیں آ رہی تھیں۔ کبھی سُنّی لڑکوں کی کبھی شیعہ لڑکوں کی۔ نرس جو اُن کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی اُنھیں آکر بتاتی تھی۔ اسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے کیفی نے یہ نظم لکھی:

عزا میں بہتے تھے آنسو یہاں، لہو تو نہیں
یہ کوئی اور جگہ ہوگی، لکھنؤ تو نہیں

یہاں تو چلتی ہیں چھریاں زبان سے پہلے
یہ میر انیس کی، آتش کی گفتگو تو نہیں

ٹپک رہا ہے جو زخموں سے دونوں فرقوں کے
بہ غور دیکھو یہ اسلام کا لہو تو نہیں

تم اِس کا رکھ لو کوئی اور نام موزوں سا
کیا ہے خون سے تم نے جو وہ وضو تو نہیں

سمجھ کے مال مرا جس کو تم نے لُوٹا ہے
پڑوسیو! یہ تمہاری ہی آبرو تو نہیں

بجھا رہے ہیں جسے آپ اپنے دامن سے
کہیں یہ آپ ہی کی شمعِ آرزو تو نہیں

1977

شبانہ جو شوٹنگ پر سے اپنے ابا کو دیکھنے آئی تھی۔ دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگی ''ممی ہم ابا کی تکلیف صرف دیکھ سکتے ہیں اِس میں حصہ تو نہیں بٹا سکتے، اُسے کم تو نہیں کر سکتے۔''

کیفی غیر معمولی قوتِ ارادی کے انسان تھے۔ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے تک جب کوئی اُن سے پوچھتا ''کیفی کیسی طبعیت ہے؟'' وہ مسکرا کر کہتے ''فرسٹ کلاس۔''

زندگی بھر وہ فرسٹ کلاس ہی رہے۔ ایک کے بعد ایک بیماریوں نے اُنھیں گھیرا لیکن جو کام اُنھیں کرنا تھا وہ کرتے رہے۔ کبھی ہار نہیں مانی۔ مشاعروں میں جہاں بُلائے جاتے، ضرور جاتے۔ گوپال جو اُن کا سارا کام کرتا تھا ہمیشہ اُن کے

ساتھ ہوتا۔ کسی مشاعرے میں میں جاتی تھی کسی میں نہیں۔

کیفی نے تمام پریشانیوں کے باوجود اپنے چھوٹے سے گاؤں مجواں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ دو کلومیٹر سڑک بنوا کے مجواں کو پھول پور سے جوڑ دیا۔ یہ کام بہت ضروری تھا کیوں کہ پھول پور میں ریلوے اسٹیشن ہے۔ جس پر اُس وقت چھوٹی لائن کی گاڑیاں چلتی تھیں۔ جو شاہ گنج سے اعظم گڑھ تک آتی جاتی تھیں۔ سارے علاقے میں یہی ایک اسٹیشن تھا۔ پھول پور اسٹیشن کا نام کسی انگریز کے نام پر 'خراسن روڈ' رکھا گیا تھا۔ ایک دن گورنمنٹ کا آرڈر آیا کہ پھول پور اسٹیشن توڑ دیا جائے۔ وہاں اسٹیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ پٹریاں اُکھاڑی جانے لگیں۔ غریب لوگ کیفی کے پاس فریاد لے کر آئے کہ اس اسٹیشن کو توڑا نہ جائے، ہمیں بہت تکلیف ہو جائے گی۔ خبر آئی کہ لوگوں نے اسٹیشن پر جلوس نکالا ہے اور وہاں لاٹھی چارج ہوگیا ہے۔ پولس لڑکوں کو مار رہی ہے۔ کیفی کے ساتھی ہرمیندر پانڈے بھی پولس کے ہاتھوں بری طرح زخمی ہوگئے ہیں۔ کیفی سیدھے اپنی وھیل چیر پر اسٹیشن پہنچے۔ اُسی وھیل چیئر سمیت پٹریوں کے بیچوں بیچ بیٹھ گئے۔ اسٹیشن ماسٹر گھبرا گیا پٹریاں جو اُکھاڑی جارہیں تھیں، روک دی گئیں۔ افسروں نے سوچا ہوگا کہ یہ کام ایک دو دن بعد پولس کے بہتر انتظام کے ساتھ کریں گے۔ یہ مہلت پاتے ہی کیفی سیدھے دہلی گئے اور ریلوے منسٹر جعفر شریف سے ملے۔ کیفی نے اُن سے کہا کہ آپ کی پولس نے میرے گاؤں والوں کو اس بے دردی سے مارا ہے کہ اُن کا جسم لہولہان ہو گیا ہے۔ میں خون میں بھری ہوئی ایک شرٹ لایا ہوں جو میرے بریف کیس میں ہے۔ آپ کہیے تو دکھاؤں۔ جعفر شریف صاحب گھبرا گئے، کہنے لگے ''نہیں نہیں رہنے دیجیے۔ میں ابھی آرڈر دے دیتا ہوں کہ آپ کے گاؤں کی

ریلوے لائن نہ توڑی جائے۔'' چنانچہ کیفی وہ آرڈر لے کر پھر اپنے گاؤں آئے۔ یہ بات کیفی کے سوا صرف مجھے پتا ہے کہ اُس بریف کیس میں کوئی شرٹ نہیں تھی۔ کیفی نے صرف ریلوے منسٹر کو ڈرایا تھا۔

کیفی جب یہ آرڈر لے کر گاؤں پہنچے تو گاؤں والے خوشی سے ناچنے لگے۔چھوٹی لائن پھر جاری ہو گئی لیکن کیفی خاموش نہیں رہے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے بڑی لائن کی مانگ کی۔ اُس وقت تک دوسرے ریلوے منسٹر رام ولاس پاسوان آ گئے تھے۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ اِس چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں تبدیل کر دیں گے۔ کچھ عرصے بعد بڑی لائن کا افتتاح ہوا اور اس موقع پر ملائم سنگھ یادو بھی تھے۔ بڑی لائن تو ہو گئی لیکن پھر بھی ایک کمی تھی کہ کوئی ایکسپرس ٹرین پھول پور نہیں رکتی تھی۔ جب نتیش کمار ریلوے منسٹر ہو کر آئے، کیفی نے اُن سے درخواست کی کہ جو ٹرین پھول پور سے گزرے وہ وہاں ضرور ٹھہرے چنانچہ گورکھپور سے بمبئی جانے کے لیے اب روزانہ ایک نئی سُپر فاسٹ ٹرین جس کا نام گئودان ایکسپریس ہے، پھول پور بھی رکتی ہے۔گاؤں والوں کے لیے اِس ٹرین کا پھول پور رکنا کسی چمتکار سے کم نہیں تھا۔ کیفی کے بعد، اعظم گڑھ سے دلّی جانے والی ایک فاسٹ ٹرین کا نام کیفی کے شعری مجموعے کیفیات کی مناسبت سے 'کیفیات' رکھا گیا ہے اور یہ ٹرین بھی روزانہ چلتی ہے۔ اِن گاڑیوں کی وجہ سے گاؤں والوں کو اتنی سہولت ہو گئی ہے کہ جس کا تصور بھی وہ نہیں کر سکتے تھے۔

کیفی کا رشتہ اپنے بچوں کے ساتھ دوستوں کا سا تھا۔ اگر کبھی بچوں سے غلطی ہو جاتی تو اُنھیں ڈانٹتے نہیں تھے۔ صرف اپنی رائے دے دیتے تھے۔اُنھیں بے پناہ چاہتے تھے۔ شبانہ چھوٹی سی تھی۔ اُسے آم بہت پسند تھے لیکن گھر میں غریبی

کا دور دورہ تھا۔ آم مہنگے تھے اِس لیے گھر میں کم ہی آتے تھے۔ ایک دن اپنی سہیلی پَرنا کے گھر سے دو درجن آم لے آئی اور خوش خوش مجھے بتانے لگی ''ممی پَرنا کے گاؤں سے آم آئے تھے تو اُن کی ممی نے مجھے اتنے سارے آم دے دیے۔'' کیفی کے دل میں یہ بات تیر کی طرح چُبھ گئی۔ بولے کچھ نہیں، بیماری کے بعد جب اپنے گاؤں میں رہنے کا خیال جاگا تو اُن کے پاس صرف پانچ بیگھہ زمین بچی تھی ورنہ ماں باپ کے پاکستان چلے جانے کے بعد گاؤں کے لوگوں نے اُن کے ابا کے گھر اور زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کیفی اپنے ایک دور کے رشتے دار صفدر بھائی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ سب سے پہلا کام کیفی نے جو کیا، ایک ٹرک کرائے پر لی اُس پر بیٹھ کر ملیح آباد گئے اور آم کے تین سو پیڑ لے آئے۔ آم کا باغ لگایا۔ ایک نوکر رکھا اور پانچ سال بعد جب اُس میں پھل آئے تو سب سے پہلے کئی سو آم شبانہ کے لیے بمبئی لے آئے۔ وہ آم کا باغ آج بھی ہے۔ اُس کے آم شبانہ کے لیے ضرور آتے ہیں۔ اِس سال بھی گاؤں سے شبانہ کے لیے آم آئے لیکن اب کیفی نہیں ہیں جنھوں نے یہ باغ اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے لگایا تھا۔

کیفی ایک شفیق باپ، ایک ideal شوہر اور عام انسانوں سے پیار کرنے والے انسان تھے۔ اپنے بیٹے بابا اعظمی کے کیمرہ مین بننے کے بعد پہلا انٹرویو اخبار میں چھپا تو اُسے کاٹ کر فریم کروایا اور اپنی میز کے سامنے کی دیوار پر ٹانگ دیا۔

جاوید کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اِس دور کا ایک بہت اچھا شاعر ہے۔

اپنی بہوتنوی کو ہمیشہ دلہن پاشا کہتے تھے۔ حیدر آباد میں بہو کو یہی کہا جاتا ہے۔ بابا اور تنوی کے گھر جا کر ہمیشہ بہت خوش ہوتے تھے۔ نظم 'دوسرا بن باس' بابری مسجد کے گرنے پر جو فسادات ہوئے تھے اُس موضوع پر یہ نظم اُنھوں اپنے بیٹے کے گھر

میں ہی لکھی تھی۔ ایک انٹرویو میں تنوی نے کیفی کے بارے میں کہا تھا ''ابا کی تعریف ہو یا انھیں کوئی انعام دیا جا رہا ہوتو ان کے چہرے سے ایسا لگتا تھا کہ یہ تعریف کسی اور کی ہو رہی ہے یہ انعام کسی اور کو دیا جا رہا ہے، ان کو نہیں۔''

کتابیں اور Mont Blanc پین جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کی لائبریری میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ کتابیں تھیں۔ ان میں سے ایسی بھی کتابیں تھیں، جو نایاب ہیں۔ شبانہ نے کیفی کی تمام کتابیں علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری کو دے دیں

کیفی کو اپنے گاؤں سے دیوانوں کی طرح عشق تھا۔ اُس کی برائی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اِسی شدت سے کمیونسٹ پارٹی سے محبت کرتے تھے۔ سوشلزم پر یقین رکھتے تھے۔ پارٹی کارڈ ہمیشہ ان کے بریف کیس میں رہتا تھا اور اکثر اُسے نکال کر بڑے فخر سے کہتے ''یہ میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔''

کبھی کبھی کیفی ایسی باتیں کرتے تھے جو صرف ایک رہنما ہی کر سکتا ہے۔کیفی نے مجواں کی بہبودی اور ترقی کے لیے ایک welfare society بھی بنائی ہے۔ اپنی زمین پر اُس کا آفس اور کمرے بنائے۔ ہر کمرے میں پنکھے لگوائے۔ گاؤں والوں کو تو انھیں پریشان کرنا ہی تھا۔ اس لیے ایک رات چاروں پنکھے کسی نے چرا لیے۔ گاؤں میں ہنگامہ مچ گیا۔ کیفی بالکل خاموش رہے۔ شبانہ نے پوچھا ''ابا آپ کو اِس بات سے frustration نہیں ہوا؟''

شبانہ کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگے ''بیٹے جب آپ تبدیلی کے لیے کام کرتے ہیں تو اس امید میں یہ گنجائش بھی رکھنا چاہیے کہ شاید یہ تبدیلی آپ کی زندگی میں نہیں آئے لیکن پھر بھی آپ کو اپنا کام تو کرتے ہی رہنا چاہیے۔''

کیفی جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں ایسے لوگ مرتے نہیں بلکہ امر ہو جاتے ہیں۔

میں اپنے دل کو سمجھاتی ہوں کیفی کہ تم امر ہو گئے ہو لیکن اِس کا کیا کروں کہ بار بار خیال آتا ہے کہ تمہارے بغیر میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں کیفی۔

شوکت کیفی

ضمیمے

چند یادگار ڈرامے اور فلمیں

پرتھوی تھیٹر

شکنتلا	1944
دیوار	1945
پٹھان	1947
غدار	1948
آہوتی	1949
کلاکار	1952
پیسہ	1954
کسان	1956

انڈین پیپلز تھیٹر ایسوی ایشن (IPTA)

دھانی بانکے	1947
بھوت گاڑی	1947
ڈمرو	1957
افریقہ جوان پریشان	1964
لال گلاب کی واپسی	1965
الکشن کا ٹکٹ	1965

آذر کا خواب	1967
تنہائی	1971
آخری سوال	1978
سفید کنڈلی	1978
اینٹر اے فری مین	1982

تھیٹر گروپ

شیشوں کے کھلونے	1957
سارا سنسار اپنا پریوار	1959
شاید آپ بھی ہنسیں	1959
نوکرانی کی تلاش	1957

تریوینی رنگ منچ

پگلی	1961
انڈر سیکریٹری	1963

انڈین نیشنل تھیٹر (INT)

ایڈیپس ریکس	1962

فلمیں

حقیقت	1964
ہیر رانجھا	1970
نینا	1973
گرم ہوا	1973
لوفر	1973
سُویکار	1973
دھوپ چھاؤں	1977
آنگن کی کلی	1979
انسپکٹر ایگل	1979
اُمراؤ جان	1981
بازار	1982
راستے پیار کے	1982
لوری	1984
انجمن	1985
سلام بابے	1988

کیفی کا خط
شوکت کے نام

۱۱ نومبر

مجواں

شوکت میری جان! پہلے کچھ شعر سنو پھر دوسری باتیں

شعر

اتنی مدت سے مری جان جدا ہو مجھ سے
یہ بھی معلوم نہیں خوش کہ خفا ہو مجھ سے
صبح کو آنکھیں جو کھل جاتی ہیں جھلاتا ہوں
دور نزدیک کہیں تم کو نہیں پاتا ہوں
چاء گوپال پلاتا ہے پئے جاتا ہوں
یہ کوئی جینا نہیں پھر بھی جیے جاتا ہوں
کان میں پڑتی نہیں آپ کی میٹھی آواز
گاؤں میں ہوں کہ جہنم میں یہ کھلتا نہیں راز
جب زیادہ کبھی تنہائی میں گھبراتا ہوں
کوئی سمجھائے نہ سمجھائے سمجھ جاتا ہوں
یہ تو خود اپنے کئے کی میں سزا پاتا ہوں
بمبئی چھوڑ کہ کیوں آگیا پچھتاتا ہوں

اپنی تکلیف کے ساتھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ تم تو مجھ سے زیادہ تنہا ہو۔ میں تم سے اور تم بچوں سے دور رہ کے تنہا ہوں۔ تم بچوں میں رہ کے تنہا ہو اور ہم دونوں نے اپنی تنہائیاں خود مول لی ہیں۔ شوکت! اگر حسینہ بھی گرین ایکر چلی گئی ہوگی تو کیا کھانا تم کو پکانا پڑتا ہے یا کوئی نوکر مل گیا؟ میری جان پیسوں کی تکلیف نہ اُٹھانا۔ جب ضرورت ہو فوراً لکھنا۔ تھوڑی بہت ضرورت تو میں پوری کرسکوں گا۔ اب مشاعروں میں زیادہ جاؤں گا اور پیسے زیادہ بچاؤں گا۔ جانکی کُٹیر کا کرایہ ماہ بہ ماہ دینا بہت ضروری (ہے) ورنہ وہ گھر ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جی بہت چاہتا ہے کہ فوراً ہی بھاگ آؤں لیکن دور کاوٹیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ دور نہ ہوں بمبئی نہ آؤں گا۔ ایک تو ۲۶ دسمبر کو کلپ ناتھ رائے کا آنا۔ دوسرے گرین

ایکر کا ٹیلیفون اور گیس۔ اُمید ہے کہ یہ دونوں کام بہت جلد ہو جائیں گے۔ جب میں بمبئی آیا تھا تو تنوی اتنی اُداس تھی کہ پہلے میں نے اُس کو اتنا اُداس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے کہا تھا ''آپ جائیں لیکن جیسے (ہی) آپ کا کام ہو جائے، فوراً آجائیں۔'' یہ تو محبت کی بات ہے۔ دوسرا فقرہ زیادہ تکلیف دہ تھا کہ ''آپ میرا بہت بڑا سہارا ہیں۔'' میں جب اِس فقرے کی گہرائی میں جاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ شاید اُس وقت وہ بابا سے کچھ خفا ہو گی ورنہ اُس کا سب سے بڑا سہارا وہی ہے۔ خدا اُس کے سہارے کو سلامت رکھے۔ ابھی ابھی میری لاڈلی بیٹی کا خط ملا ہے وہ ہندی میں ہے اِس لیے پڑھ نہیں سکا ہوں۔ ریاست کو بلوایا ہے۔ اُنھیں سے پڑھواؤں گا۔ ابھی ابھی دلّی سے اشتیاق عابدی کا بھی خط آیا ہے۔ وہ اِس لفافے میں رکھ رہا ہوں۔ شبانہ کو بھی سنا دینا اور تنوی اور بابا کو بھی۔ میں ۲۴ نومبر کو لکھنو جاؤں گا۔ وہاں سے آپ سے فون پر باتیں ہوں گی۔ جب تک تمہاری طبعیت بالکل ٹھیک نہ ہو جائے آنے کی ضرورت نہیں۔ خدانخواستہ تمہاری طبعیت زیادہ خراب ہوئی تو میں خود آجاؤں گا اور خود تمہارا علاج کرواؤں گا۔ ضرورت ہوئی تو دھرم سالہ لے کے چلوں گا۔

بہت سا پیار

تمہارا کیفی

[illegible]

تمہارا کیفی

شوکت کے نام کیفی کا ہاتھ سے لکھا خط (2)

گھر آنگن سے : چند تصویریں

شوکت کیفی 24 سال کی عمر میں

کیفی اعظمی 29 ربرس

(ڈاکٹر رشید جہاں کا کرتا پہنے ہوئے)

شوکت کیفی

(پرتھوی راج کپور کے گھر پر ایک دعوت میں)

شوکت اور کیفی پہلے بیٹے خیام کے ساتھ (1948)

ماتھیران میں چھٹی گزارتے شوکت اور کیفی (تصویر: سمیر آریہ)

جانکی کٹیر میں (بائیں سے) بابا، تنویر، شوکت، کیفی، شبانہ، جاوید (1986)

شوکت کیفی (بیچ میں) اپنی بہنوں — لیاقت خانم (بائیں) اور ریاست خانم (دائیں) کے ساتھ

خوشی کے لمحے : جانکی کٹیر میں کیفی شبانہ اور شوکت (1980)

کیفی اور شوکت جُوہو بیچ پر

اعظم گڑھ کی ایک محفل میں کیفی اور شوکت

ایک فلم کے پریمئر پر لتا منگیشکر، گلزار، کیفی اور شوکت

شوکت اپنی بیٹی اور بڑی بہن لیاقت کی نواسی تبو کے ساتھ (2004)

ایک اداکارہ : چند روپ

فلم 'امراؤ جان' میں شوکت کیفی

فلم 'انجمن' میں شوکت کیفی (1984)
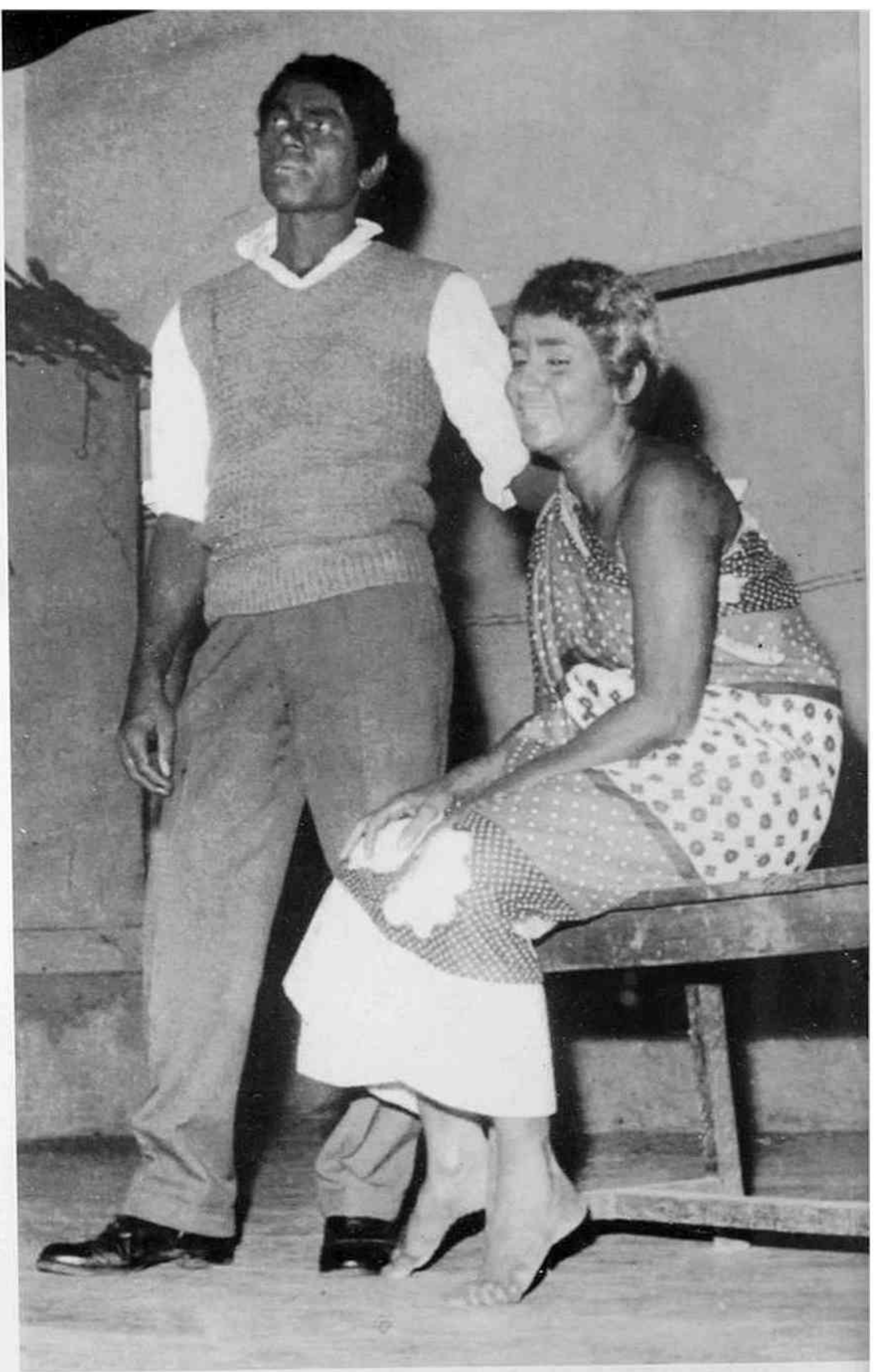
شوکت کیفی رام سنگھ کے ساتھ اپٹا کے ناٹک 'افریقہ جوان پریشان' میں (1958)

ناٹک 'پگلی' میں شوکت کیفی
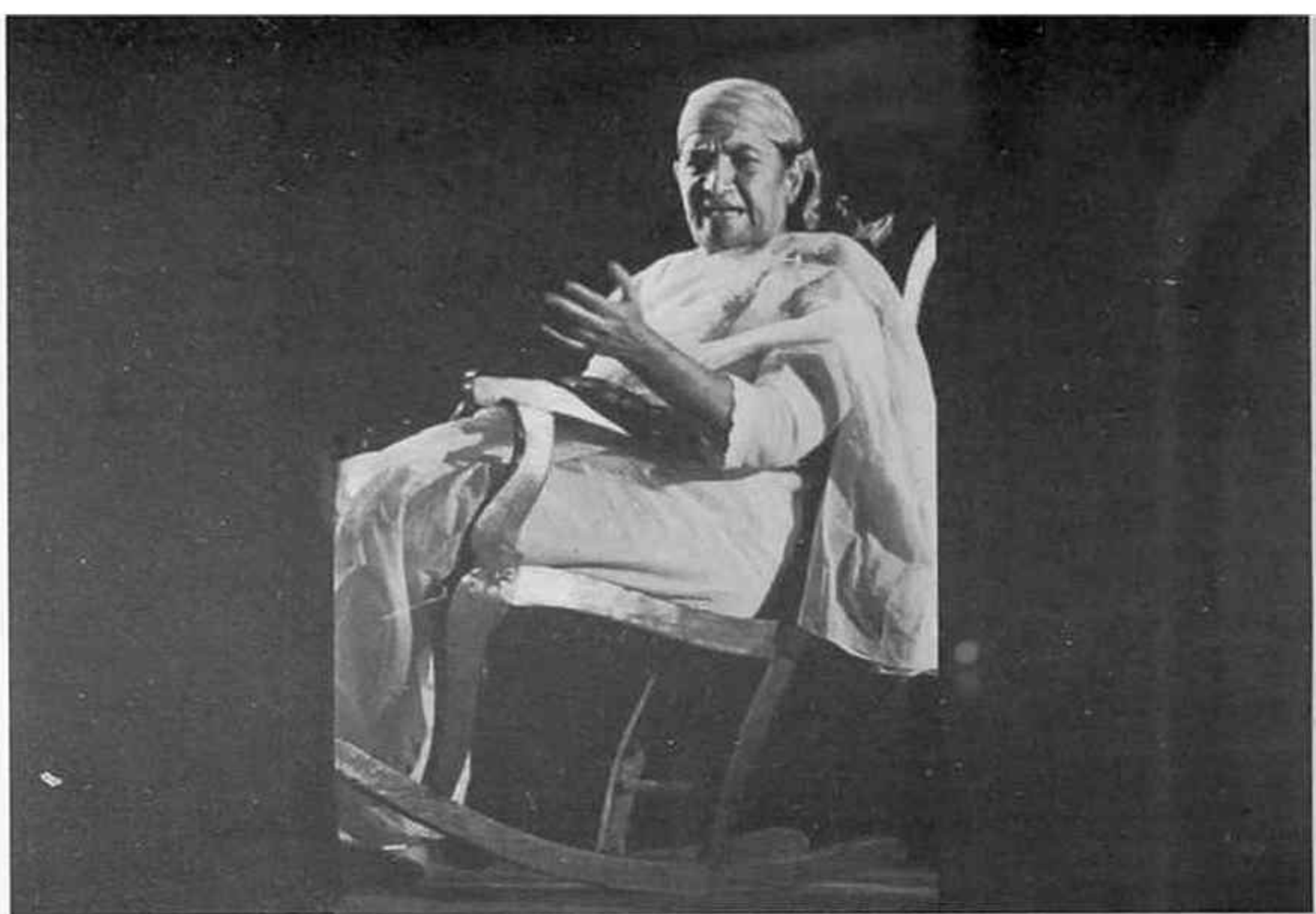
فلم 'ہیر رانجھا' میں شوکت کیفی

اپٹا کے 50 سال پورے ہونے پر 'افریقہ جوان پریشان'
کے ایک منظر میں شوکت کیفی

فلم 'گرم ہوا' میں بلراج ساہنی اور شوکت کیفی (1973)

فلم 'سلام بامبے' میں شوکت کیفی اور نانا پاٹیکر (1987)
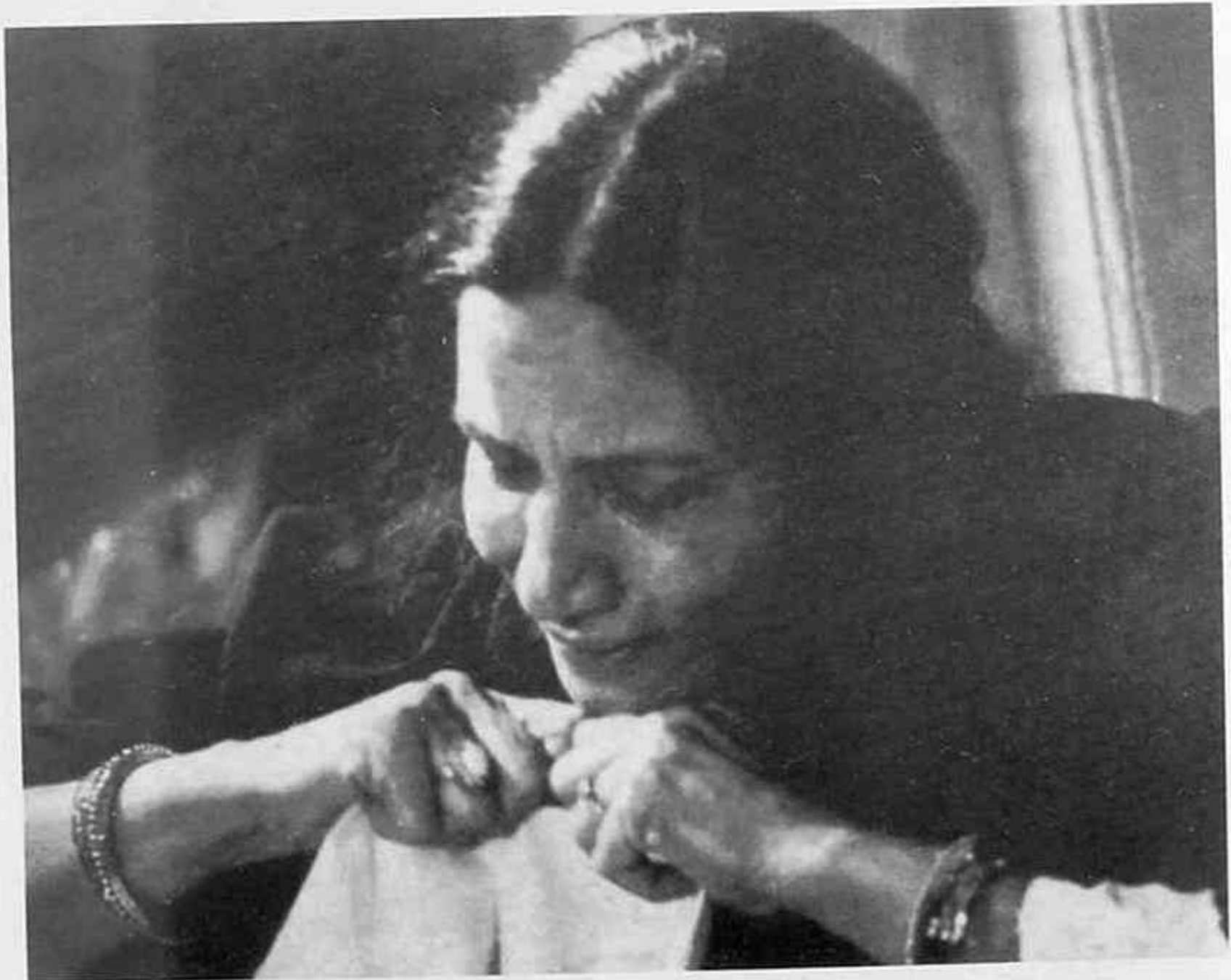
ایم. ایس. ستھیو کی 'گرم ہوا' میں شوکت کیفی (1973)

ستیہ جیت رائے نے کہا تھا شوکت کو اس فلم میں اداکاری کے لئے سب سے بہترین فنکارہ کا ایوارڈ ملنا چاہیے۔